ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۴۴

چوتھا سال: آٹھویں کتاب

اگست ۲۰۰۶ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey_90@hotmail.com
فون: ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶
کمپوزنگ: اظہر خان (یونی کارن کمپیوٹرز چونگی نمبر ۶ ملتان)

قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

گوشۂ ڈاکٹر معین الرحمٰن:

۲۔ معین صاحب — ابوبکر صدیقی — ۴
۳۔ سیّد معین الرحمٰن۔ زیست کرنا کوئی اُن سے سیکھے — پروفیسر منور علی ملک — ۷
۴۔ شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں — عاصم محمد کلیار — ۹
۵۔ سیّد معین الرحمٰن کی خاکہ نگاری — ایم خالد فیاض — ۱۴
۶۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا آخری انٹرویو — ثروت حسنین عامر — ۲۰
۷۔ دو غزلیں معین الرحمٰن کے لیے — جمشید چشتی/بدر منیر الدین — ۲۳
۸۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے چار قدیم اور نادر خطوط — ڈاکٹر معین الرحمٰن — ۲۴

مضامین:

۹۔ کارل گستاؤ ژونگ اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں — تنویر صاغر — ۳۰
۱۰۔ ڈاکیا اور جولاہا — رانی آکاش ہاشمی — ۳۳

ڈرامہ:

۱۱۔ خون خاک نشیناں — ڈاکٹر انوار احمد — ۳۹

کتابوں پر تبصرے:

۹۔ تاریخ کا فریب — قاضی جاوید — ۵۸
۱۰۔ آدھا سچ — صائمہ نورین بخاری — ۵۹

کہانی:

۱۱۔ شہر، چوراہے اور سڑکیں — ڈاکٹر خالد سنجرانی — ۶۲

نظمیں:

۱۲۔ کس طرح (تحسین گیلانی)، مجھے کون بلاتا رہتا ہے (فہیم شناس کاظمی)، گرتا ہوا آسمان (فہیم شناس کاظمی) — ۶۵

حروفِ زر

۱۳۔ قارئین کے خطوط — بنام مرتب — ۶۸

سید عامر سہیل

چند باتیں

آج کل کی صورتِ حال کے حوالے سے فیض کی یہ نظم بہت گہری معنونیت رکھتی ہے۔ یہ ذاتی تجربہ بھی ہے اور اجتماعی صورتِ حال کا بیان بھی ہے۔

آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ، کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست ورقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگ و دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ نا کام بھی

ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب با صفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو، دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

(فیض احمد فیض)

☆☆☆

ابوبکر صدیقی

معین صاحب

پروفیسر ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن، اعزازِ فضیلت، صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور، محکمہ تعلیم پنجاب کے اب تک اُردو کے واحد پروفیسر ہیں جو اکیسویں گریڈ تک پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب طویل عرصہ تک جی سی لاہور میں صدر شعبۂ رہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے شعبۂ اُردو کی صدارت کا حق ادا کر دیا۔ جب کبھی انہیں کسی انتظامی عہدہ کی پیش کش ہوتی، وہ صاف انکار کر دیتے اور کہتے کہ میں درس و تدریس ہی میں خوش ہوں اور یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ وہ آخر تک اپنے اسی اُصول پر قائم رہے اور اسی عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات پنجاب یونیورسٹی کے اُردو بورڈ آف اسٹڈیز کے اجلاسوں میں ہوا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ کوئی چھ سالوں تک جاری رہا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ مقررہ وقت سے کچھ پہلے میٹنگ روم میں پہنچ جاتے اور اپنی مخصوص جگہ، صدر جلسہ کے دائیں ہاتھ والی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب تاخیر سے پہنچے ہوں۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرا سادہ لباس پہنتے تھے۔ چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ ہوتی۔ گفتگو میں حصہ لیتے تو ان کا لہجہ بڑا شیریں ہوتا۔ آواز دھیمی اور بولنے کی رفتار ایسی ہوتی کہ ان کا ادا کیا ہوا، ایک ایک لفظ واضح طور پر سنائی دیتا۔ استاد کی گفتار ایسی ہی ہونی چاہیے کہ اس کا کہا ہوا بآسانی سمجھ میں آجائے۔ ڈاکٹر صاحب کم بولتے تھے۔ صرف ضروری بات مختصر الفاظ میں ادا کر دیتے تھے۔ مجھے ان کی گفتگو میں گرما گرمی کی کیفیت کبھی نظر نہ آئی لیکن ان کی بات ایسی وزنی ہوتی کہ ہمیشہ تسلیم کی جاتی۔

ڈاکٹر صاحب نے جی سی لاہور میں بڑی محنت سے کام کیا۔ درس و تدریس کو ایک معیار بخشنے کے علاوہ انہوں نے اپنے شعبہ میں اعلیٰ شرافتوں کی قدریں رائج کیں اور ان کی پاسداری کی۔ تصنیف و تالیف سے انہیں عشق تھا۔ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اس طرف اپنے رفقائے کار کو بھی راغب کیا۔ تحقیق نامہ کے نام سے ایک تحقیقی مجلّہ اپنے شعبہ کی طرف سے شائع کرنا شروع کیا جو کسی طرح بھی کسی یونیورسٹی ریسرچ جرنل سے کم نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے شعبہ میں تحقیق کا بہت کام کروایا۔ ہر سال متعدد مقالات اپنے شاگردوں سے اپنی اور اپنے رفقا کی نگرانی میں لکھواتے تھے۔ ان میں بہت سے مقالات اعلیٰ معیار کے حامل ہیں۔ اکثر ایسے ہیں جو مدتوں بطور کتاب حوالہ استعمال ہوتے رہیں گے۔ بہت سے مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا فراہم کردہ یہ عظیم تحقیقی سرمایہ عرصہ دراز تک جی سی کے لیے نیک نامی کا ذریعہ بنا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کو کتابوں کی ترتیب و تدوین میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ ایڈیٹنگ کا بڑا

اچھا شعور رکھتے تھے۔ ان کی کتابیں ترتیب وتدوین، لکھائی، چھپائی، ظاہری اور باطنی حُسن کا ایسا نمونہ ہیں جنہیں دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا تو میں ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب غالبؔ کے پرستار تھے۔ غالبؔ کے متعلق جو کچھ ملتا جمع کرتے رہتے تھے۔ نئی نئی باتوں کا کھوج لگاتے، تحقیق کرتے، نتائج مرتب کرتے اور انہیں مقالات و کتب کی صورت میں شائع کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں دوسرے ممالک کے ماہرینِ غالبیات سے رابطہ رکھتے تھے۔ دوسرے ملکوں میں غالب پر شائع ہونے والی کتابیں منگواتے رہتے تھے۔ کوئی مخطوطہ مل جاتا تو اسے بڑی حفاظت سے رکھتے تھے۔ اس طرح انہوں نے غالبیات سے متعلق کتب ورسائل اور مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے جو آئندہ غالب پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے غالب کا ایک نایاب دیوان عکسی صورت میں بڑے اہتمام سے نسخۂ خواجہ کے نام سے شائع کیا جو اَب تک غالب کے شائع شدہ اُردو دواوین میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا ایسا کارنامہ ہے جو مدتوں یادگار رہے گا۔ غالب کے متعلق ان کی تحقیقی کتابیں بھی غالبیات کے ذخیرے میں اہم اضافہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور تدوین وتحقیق کا شاندار ریکارڈ چھوڑ کر ریٹائر ہوئے۔ ان کے سامنے تحقیق کے کئی منصوبے تھے کئی کتابیں ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزر رہی تھیں لیکن کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد۔ ڈاکٹر صاحب کو دوسری دنیا سے بلاوا آ گیا۔ وہ سب کچھ دوسروں کے لیے چھوڑ کر اگلے سفر پر روانہ ہو گئے لیکن علم وادب کی دنیا میں ان کے چھوڑے ہوئے نقوش اتنے پختہ ہیں کہ مٹائے نہ مٹیں گے۔

ایک خیال بار بار پریشان کرتا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور ایسا ادارہ ہے جو اپنے اکابرین کو یاد رکھا کرتا تھا۔ ان کا نام احترام سے لیتا تھا اور ان کی یادگاریں قائم کیا کرتا تھا۔ خدا جانے کیا ہوا کہ اس عظیم ادارے نے ڈاکٹر صاحب کو یکسر فراموش کر دیا۔ وہ شعبۂ اُردو جسے ایک وقار بخشنے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں انہیں یوں بھول گیا گویا وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کارگزاری اس امر کی مستحق تھی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی شعبۂ اُردو کسی نہ کسی طور ان سے رابطہ رکھتا اور ان سے رہنمائی حاصل کرتا۔ ایسا کارکن صدر شعبہ تو جی سی کو مدتوں میسر نہ آئے گا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ بہر طور یہ اصول تو پیشِ نظر رہنا چاہیے:

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

یہ بات بھی بڑی دل خراش ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے آخری ایام میں کچھ لوگ خدا جانے کیوں

ان کی مخالفت پر آمادہ ہوئے، ان کے خلاف جلسے ہوئے، کتابیں لکھی گئیں، حیرت ہے کہ اس سلسلے میں بڑے بڑے محترم نام سامنے آتے ہیں۔ اختلاف تو کوئی بڑی بات نہیں لیکن اسے دشمنی کا درجہ دے کر بات رسوائی اور دشنام طرازی تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ کم از کم اہلِ علم کا تو یہ دستور نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب حساس طبیعت کے حامل تھے۔ ان باتوں کا اثر انہوں نے لازماً قبول کیا ہوگا۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کی خوبیاں اپنی جگہ قائم ہیں۔ ان کی معصوم مسکراہٹ، ان کا شیریں لہجہ، ان کا مدھم اندازِ گفتگو، ان کی ہمدردانہ باتیں ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔ خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر منور علی ملک

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن ۔ زیست کرنا کوئی ان سے سیکھے

معاصر ادب میں ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کا مقام و مرتبہ تو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اُن کی شخصیت کے محاسن کا جو تجربہ مجھے حاصل ہوا اُس کا ذکر منظرِ عام پہ لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے آقا نے یہ ہدایت کی تھی کہ کسی میں کوئی خوبی دیکھو تو لوگوں کو اس کے بارے میں ضرور بتاؤ تا کہ لوگ بھی وہ خوبی اپنانے کی کوشش کریں، یہ ایک کارِ خیر ہے۔

پنجاب یونیورسٹی سے ایک بچی کی ڈگری لینے کے لیے مقررہ فارم کے تصدیق نامے پر کسی گزٹیڈ آفیسر سے دستخط کروانے تھے۔ میں گورنمنٹ کالج کے شعبۂ انگریزی میں گیا کہ کسی دوست سے متعارف ہو کر اُن سے دستخط کروالوں گا مگر وہاں کوئی صاحب موجود نہ تھے کہ کلاسز ہو رہی تھیں۔ شعبۂ اُردو کے ڈاکٹر سلیم اختر صاحب سے یاد اللہ تھی کہ اُن کا قلمی انٹرویو میری کتاب ''پسِ تحریر'' میں شائع ہو چکا تھا۔ کتاب حال ہی میں چھپ کر آئی تھی۔ حُسنِ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب موجود بھی تھے، فارغ بھی، علیک سلیک کے بعد مدعا عرض کیا تو کہنے لگے۔ ''بھائی، میں تو پچھلے ہفتے ریٹائر ہو گیا۔ بہر حال آپ تشریف رکھیں، جو بھی صاحب اِدھر آتے ہیں اُن سے دستخط کروالیں گے۔'' اِدھر چائے آئی اُدھر ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور فارم پر دستخط ہو گئے۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر سلیم صاحب نے کہا ''ملک صاحب ہمارے شعبہ کے چیئرمین ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب کو آپ کی کتاب بہت پسند آئی، آپ سے مل کر وہ یقیناً بہت خوش ہوں گے۔ چلیں، اُنہیں سلام کر لیں۔''

ہم صدر شعبۂ اُردو کے دفتر میں پہنچے۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے میرا تعارف کرایا تو صدرِ شعبہ بڑے تپاک سے ملے۔ میری کتاب کے بارے میں چند تعریفی کلمات کہے۔ کاش میں وہ کلمات لکھوا لیتا تو یوں سمجھتا کہ مجھے ایم اے اُردو کی ڈگری مل گئی۔ میں نے بتایا کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہتا ہوں اور یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔ فرمایا ''یہ سلسلہ ضرور جاری رہنا چاہیے۔'' موقع مناسب جان کر میں نے عرض کیا ''سر اگر میں اس سلسلے کی اگلی کتاب میں آپ کا انٹرویو بھی شامل کرنا چاہوں تو؟'' فرمایا ''اگر آپ مجھے اس اعزاز کے لائق سمجھیں تو سوال نامہ بھجوا دیجیے جواب لکھ دوں گا۔'' اتنے بڑے آدمی کا اس قدر انکسار دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔ ایک ہم ہیں کہ چار لفظ لکھ کر چھپوا لیں تو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے! عقیدت کے آنسو روکنے کی کوشش میں صرف "Thank you, Sir" ہی کہہ سکا۔ جنابِ سیّد کی نفاستِ طبع اور شائستگی سے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی متعارف ہو چکا تھا۔ تیسری خوبی انکسار نے تو دل ہی موہ لیا۔

میانوالی پہنچتے ہی میں نے ڈاک سے سوال نامہ بھجوا دیا۔ چند روز بعد ڈاک ہی سے ایک

بھاری بھرکم پارسل موصول ہوا۔ تقریباً ۵۰ صفحے کے جواب نامے کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی متعدد تصانیف بھی ارسال فرما دی تھیں۔ یہ اندازِ کرم دیکھ کر اپنی ہی بات یاد آ گئی جو میں نے ممتاز مفتی سے کہی تھی کہ سخی لوگ سائل کا دامن نہیں، اپنی شانِ سخاوت دیکھ کر عطا کرتے ہیں۔

جناب سیّد کی تین خوبیوں کا قائل پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چوتھی سخاوت نکلی اور پانچویں خط کا فی الفور جواب دینے کی عادتِ حسنہ مگر اس طرح گننے بیٹھوں تو یہ مضمون سمٹنے میں نہیں آئے گا۔ لہٰذا خوبیوں کا شمار یہیں ختم۔

ناشر کی بعض کاروباری مجبوریوں کی وجہ سے ''پسِ تحریر'' کے سلسلے کی دوسری کتاب چھپنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو بہت خفت اُٹھانی پڑی۔ سوچتا تھا ڈاکٹر صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ پھر یوں ہوا کہ محترمہ انبساط امین عباسی نے ڈاکٹر صاحب کی بالواسطہ آپ بیتی ''دل کی کتاب'' بھجوائی تو اُس میں اس فقیر کے تعارف کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا وہی ۵۰ صفحے کا انٹرویو من وعن چھپا دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ''پسِ تحریر'' نہ چھپ سکنے پر معذرت کی شرمندگی سے کس خوب صورتی سے بچا لیا۔ اُن کی آپ بیتی میں میرا تعارف اور میرا کیا ہوا وہ انٹرویو شامل ہونا کچھ کم اعزاز نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے دوسری ملاقات کی سعادت تو تا حال نصیب نہیں ہو سکی، تاہم کبھی کبھار خط و کتابت ہوتی رہتی ہے۔ جب نسخۂ خواجہ کے حوالے سے بعض اہلِ قلم نے طوفان دشنام برپا کیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھا کہ آپ کے بیسیوں سابق طلبہ خیر سے آج کے نامور اہلِ قلم ہیں۔ تو پھر یہ لوگ اہانتِ اُستاد کا یہ افسوس ناک منظر دیکھ کر منقار زیر پر کیوں ہیں؟ ڈاکٹر معین صاحب کا جواب پڑھ کر بے اختیار آنکھیں بھیگ گئیں۔ فرمایا ''اگر میرے طلبہ میں سے کوئی میرے دفاع میں اس بحث میں اُلجھتا تو مجھے افسوس ہوتا کہ اُن کی تربیت میں مجھ سے کوئی کسر رہ گئی۔''

حُسنِ تربیت کا یہ انداز دیکھئے کہ نہ صرف خود دشنام طرازی کا جواب اُسی زبان میں دینے سے پرہیز بلکہ طلبہ کو بھی زبان و قلم آلودہ نہ کرنے کی ہدایت!!! حالاں کہ جناب سیّد کے ممدوح حضرتِ غالبؔ تو اپنے دفاع میں اپنے شاگردوں کو ہاتھا پائی سے بھی منع نہیں فرماتے تھے۔ تلامذۂ ذوقؔ اور تلامذۂ غالبؔ کے مابین معرکہ آرائیوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔ زبان اور ہاتھ کے علاوہ ہجو نگاری میں قلم سے جو کچھ لکھا جاتا رہا ___ خدا کی پناہ!! مگر اِس قسم کے معاملات میں جناب سیّد کی پالیسی، عین وہی جو ربِ کریم نے قرآن حکیم میں متعین فرما دی کہ ''....اور صبر کرو اُن باتوں پر جو وہ لوگ کہتے ہیں۔'' ''....اور اچھے طریقے سے اُن لوگوں سے کنارہ کش ہو جاؤ۔'' (سورۃ المزمل)

میرا یہ ایمان ہے کہ اگر سب لوگ یہ پالیسی اپنا لیں تو دنیا میں امن و امان کی اس سے بڑی ضمانت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ ہم سب جنابِ سیّد کے طلبہ ہوتے ___ کاش!!!

☆☆☆

عاصم محمد کلیار

شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں

''عزیزم عاصم کلیار!....کوئے بہاراں....کے ابتدائی اوراق میں افسانے کا لطف پایا۔ کیا کیا داستان سرائے اور حکایت طرازی ہوئی ہے.....روانیِ قلم اور زیادہ کی دعاؤں کے علاوہ کیا دوں!'' (ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن)

''شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں'' کے بارے میں معین صاحب کے خط کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مضمون کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے/الفاظ کیوں تھے۔ شاید اُس نسل کے پروردہ لوگ اپنی تعریف کے قائل ہی نہ تھے۔ نسل در نسل کا یہ تضاد ہم لوگوں میں اور چیزوں کی نشان دہی کرتا ہے۔

پس نوشت: معین صاحب کی زندگی میں یہ مضمون مکمل نہیں ہوا تھا۔

یہ جون ۱۹۹۶ء کی بات ہے ہم لوگ پاکستان کی بلند ترین اور بے حد دلکش رہائشی کالونی چھانگلہ گلی میں بطور کرائے دار مقیم تھے یہ رہائشی کالونی صرف پچیس تیس گھروں پر مشتمل ہے اونچے نیچے وسیع پہاڑی سبزہ زاروں پر بڑے بانکے بانکے سے کاٹیج طویل چناروں پر چیلوں کے درختوں میں گھرے سارا سال اپنے مکینوں کے انتظار میں رہتے ہیں۔ چھانگلہ گلی صرف گرمیوں کے دنوں میں آباد ہوتی ہے وہاں سارے گھر پاکستان کے امیر ترین طبقے کے لوگوں کے ہیں جو وہاں ایک خاندان کی حیثیت سے گرمیوں کے دن گزارتے ہیں اور میدانی علاقوں کو لوٹ کر وہ ایک دوسرے کو یکسر فراموش کر کے دوبارہ آئندہ گرمیوں میں تجدید دوستی کرتے ہیں۔

ہمارے گھر کے سامنے والے بنگلے میں مملکتِ خداداد کے دو سابق وزرائے اعظم قیام پذیر تھے۔ بائیں طرف والے گھر میں نعیم بخاری، چوہدری سعید کے ہاں مقیم تھا اور رتجگوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ کم کم ہی گھر سے نکلتا۔ دائیں طرف والے وسیع گھر میں پشاور کے آفریدی مسلسل مہمان نوازی میں مگن رہتے۔ ہر اتوار کو ڈاکٹر زبیدہ ڈوسل اسلام آباد سے اپنی فوکس ویگن پر آ کر اپنے بنگلے کے دلکش لان کی تراش خراش میں مصروف نظر آتیں۔ باقی کے تمام گھروں میں بھی اونچے طبقے کے لوگ اپنی شام کی محفلوں کے ذائقے کو باربی کیو سے دوآتشہ بنا کر خوش گپیوں میں مگن رہتے۔

میں چونکہ اعلیٰ سوسائٹی کے قواعد وضوابط سے ناآشنا تھا شام کو اِن لوگوں کی طرح Malaca-Cane کی چھڑیاں پکڑ کر گردن کو ذرا سا خم دے کر چہل قدمی کرتے ہوئے سگار پینا بھی میرے طبقے کے لوگوں کا

وطیرہ نہ تھا رنگیں مگوں میں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بھی میرے طبقے کے لوگوں کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے اس وقت میرے کسی ایسی شخصیت سے بھی تعلقات نہ تھے کہ جس کا نام کیش کروا کے میں چھانگلہ گلی کے لوگوں کے سامنے باریاب ہو سکتا یا ملکی سیاسی اور معاشی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں آغاز کرتا کہ کل فلاں فون پر کہہ رہا تھا کہ یہ اسمبلیاں ایک جھٹکے کی مار ہیں فلاں وزیر کا چل چلاؤ ہے۔

میں کرائے دار کی حیثیت سے وہاں صرف ایک سیزن کے لیے گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا شاید وہاں دوبارہ طویل قیام کے لیے نہ جا سکوں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان لوگوں کی دوستیاں وقتی ہوتی ہیں، یہ اپنے مفاد کے لیے دوستیوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ باوجود لاکھ کوششوں کے میں وہاں کی Community میں خود کو ایڈجسٹ نہ کر سکا۔

ان حالات میں میرے اندر کے ازلی خوف اور جھجک ناگ نے مجھے ڈسنا شروع کر دیا۔ میری شخصیت ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنے لگی۔ میں ہر وقت ایک عجیب سے خوف میں مبتلا رہتا۔ میں لاؤنج میں کھڑکی کے ساتھ رکھے چھ بائی چار کے دیوان پر پڑا سارا دن بیگم اختر کی غزلیں سنتا۔ اُداسی کی کیفیت میرے اندر غمگین شاموں کی طرح اُترنے لگی۔ اردگرد مناظر فطرت کے دل فریب نظاروں اور مسکراتے ہوئے ماحول کے باوجود میں خود کو تنہا محسوس کرتا اپنے وجود اور اپنے ہونے کے ثبات کی کھوج میں رہتا اپنی ٹوٹتی ہوئی شخصیت کو یکجا کرنے کی کوشش میں رہتا۔ اس بے بسی کے عالم میں مجھے کتابوں نے پناہ دی۔ میں ہر ہفتے مری مال روڈ جا کر Hameed Books نامی دوکان سے ڈھیروں کتابیں خرید لاتا۔ اُردو کا بہترین ادب میں نے اُنہی دنوں پڑھا۔ میں سارا دن نرم گرم دھوپ میں کتابوں کے ساتھ بسر کرتا۔ اردگرد کی دنیا سے بے خبر ہو کر کتابوں کی دنیا میں مگن رہنے لگا۔ جوں جوں لفظوں سے میری دوستی بڑھتی گئی میں نے محسوس کیا میری بکھری ہوئی شخصیت یکجا ہونے لگی ہے۔

ایک چکر پر میں Hameed Books سے دیوانِ غالب خرید لایا۔ اگرچہ دیوان کا پہلا شعر ہی میری سمجھ سے بالاتر تھا مگر میں غالب کے دیوان کی ورق گردانی کرتا رہتا۔ اپنے عقل کے سارے گھوڑے دوڑانے کے باوجود مجھے دیوانِ غالب کا ایک تہائی سے بھی کم حصہ سمجھ آیا۔ مجھے اپنے کم علم ہونے کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ خوف در خوف ___ میں ایک خوف سے نکلا تو ایک اور خوف نے آن جکڑا۔ میں پہاڑی راستوں کو پیدل ناپتے ہوئے غالب کے اشعار گنگناتا رہتا۔ غالب کے مطالعے کے دوران میں نے اپنے باپ کے علم کو کئی بار غالب کے اشعار کی کسوٹی پر پرکھا مگر اُن کا علم بھی میری تشنگی دُور نہ کر سکا۔ اپنے وجود کے ثبات کا جواز بھی مجھے غالب کے اشعار میں ملنے لگا۔

اُس روز آسمان صاف تھا میں دھوپ میں بیٹھا چائے پی رہا تھا سویرے سویرے ہی سلیمہ آ گئی۔ دنیا جہان کی باتیں کرنے کے بعد ہم تاش کی بازی لگانے میں مصروف ہو گئے۔ امی بالکونی میں کھڑی دُور نظر آنے والی لارنس کالج کی سرخ چھت کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھیں جہاں میرا بھائی

بورڈنگ میں رہ کر پڑھ رہا تھا۔ امی اُسے میڈم عفت کے حوالے کر کے کسی طور مطمئن نہ تھیں۔ آنگن میں لگے بوڑھے چیل کے درخت تلے بابے کالوکا ٹائیگر نامی کتا استراحت فرما رہا تھا۔ ایک پہاڑی لڑکا بانسری پر بے حد دلکش دھن بجا رہا تھا۔ ابو اسلام آباد سے واپس لوٹے تھے۔ Drive Way پر گاڑی سے اُترتے ہوئے انہوں نے مجھے آواز لگائی۔ تاش کی بازی میں میری پوزیشن بڑی اچھی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے بازی روک کر اُن کے پاس جانا پڑا۔ اُن کے ہاتھوں میں ایک ضخیم کتاب تھی ___ نوائے سروش ___ از مولانا غلام رسول مہر ___ شیخ غلام علی اینڈ سنز ___ لاہور ___ سالِ اشاعت ___

ابو کتاب میرے حوالے کرتے ہوئے بولے یہ ماہر غالبیات غلام رسول مہر صاحب کی غالب پر سند یافتہ آسان شرح ہے۔ اُس روز پہلی بار میں نے ماہر غالبیات کی اصطلاح سنی۔ مہر صاحب کی شرح نے ایک حد تک میری غالب کو سمجھنے میں راہنمائی کی مگر میرے اندر کسی ماہر غالبیات سے ملنے کی خواہش شدت پکڑتی گئی۔ شاید میں کسی غالب شناس کے سامنے اپنی کم علمی کی خفتوں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

میری تمناؤں سے بے خبر وقت کی گاڑی لشٹم پشٹم رواں دواں رہی۔ میری کمزور شخصیت کار جہاں کی تلخ حقیقتوں سے آشنا ہوتی رہی مگر میرے اِس نمانے سے وجود نے اُمید کا دامن تھامے رکھا۔ کتابوں سے میری دوستی بڑھتی گئی، غالب سے میری محبت اور عقیدت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ بی اے کا معرکہ سرانجام دینے کے بعد بیگم سرفراز اقبال کی سفارش کے ساتھ میں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اُردو کے سربراہ ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس پہلی ملاقات کے عرصے بعد میں نے معین صاحب کو ایک خط تحریر کیا تھا جو درج ذیل ہے:

''معین صاحب!

میں کل گھر آیا سارا دن یہی سوچتا رہا کہ گورنمنٹ کالج میں گزارے ہوئے دو سال جو اَب یوں محسوس ہوتا ہے چند لمحوں پر مشتمل تھے، میں نے اِن میں کیا کھویا یا کیا پایا۔ مجھے آپ کے ساتھ پہلی گفتگو بھی یاد ہے جب داخلے کے سلسلے میں آپ کے پاس آیا تھا۔ دروازے پر اجازت مانگنے پر آپ نے کہا تھا ''آیئے ___ آیئے تشریف رکھیے۔'' پھر عینک کے اوپر سے اپنی شگفتہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا ''جی کہیے کیسے آنا ہوا؟'' میں نے اپنی بے سُری آواز میں کہا تھا ''سرفراز اقبال نے بھیجا ہے فیض صاحب کی دوست ہیں ناں۔'' میز کے اُس طرف سے ایک میٹھی آواز آئی جس کا میں اُسی وقت اسیر ہو گیا تھا۔ ''او ___ ہو۔ وہاں تک کیسے پہنچ گئے۔۔۔۔۔۔''

عاصم کلیار

۶/۶/۲۰۰۲

اس مختصر سے مکالمے کے بعد معین صاحب نے بھاری بھرکم سفارش ہونے کے باوجود مجھے داخلہ ٹسٹ اور انٹرویو کی کڑی شرائط سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی چائے کی پیشکش کی۔ چائے کے آنے تک وہ دفتری کاغذوں میں کھوئے رہے اور میں کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ معین صاحب کی پشت پر غالب کی تانبے کی تصویر آویزاں تھی۔ اُس کے نیچے پڑے Book Shelf پر غالب کا چینی کا بنا بُت تھا۔ غالب چوکڑی مارے بیٹھا سامنے رکھی چوکی پر کسی کے خط کا جواب لکھ رہا تھا اس چینی کے سفید بت کے ساتھ پڑی فلاسک پر غالب کی تصویر اور اُس کے چند اشعار تحریر تھے۔ معین صاحب کے سامنے رکھے میز کے شیشے تلے غالب کی تصویر کے دو رنگین پوسٹر بڑے سلیقے کے ساتھ پڑے تھے۔ میز پر غالب کے حوالے سے مشہور مصور، خطاط اور شاعر صادقین پر لکھا ایک تھیسس کھلا پڑا تھا۔ معین صاحب کی ساتھ والی کرسی پر ایک چمڑے کا تھیلا پڑا تھا جو غالب کے حوالے سے کسی کانفرنس کے موقع پر تیار کیا گیا تھا۔ اس تھیلے کو بعد میں آنے والے دنوں میں ہم لوگ زنبیل کے نام سے یاد کرتے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''جی آپ کو غالب سے بہت زیادہ شغف ہے؟''

معین صاحب نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے اُسی لمحے اُن کی انعام یافتہ کتاب ''غالب اور انقلاب ۵۷ء'' یاد آ گئی۔ مکافاتِ عمل ___ اتفاقاتِ زمانہ ___ حقیقت افسانے سے عجیب تر ہے ___ چند سال پہلے میرے دل میں کسی ماہر غالبیات سے ملنے اور اپنی کم علمی کی خفتوں کو مٹانے کی خواہش پوری ہو گئی ___ اور سچ مچ برصغیر کے مشہور ماہر غالبیات ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر بیٹھے تھے۔

داخلے اور انٹرویو کی آزمائشوں سے گزر کے آخر میں Ravian کہلانے کا مستحق ہوا۔ باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے کالج کے مین گیٹ سے داخل ہو کر ٹاور کی جانب چڑھائی چڑھتے ہوئے تیز تیز قدموں سے شعبۂ اُردو کی جانب رواں دواں تھا۔ بائیں ہاتھ اوول گراؤنڈ کی کیاریوں میں پھول رنگ رنگ کے کھلے ہوئے تھے۔ پہلے دن کے پہلے پیریڈ میں معین صاحب ایک ہاتھ میں زنبیل کو تھامے ہونٹوں پر ہمیشہ قائم رہنے والی دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ سمیت کلاس میں آئے۔ تعارف کے دوران معین صاحب ہم سے پسندیدہ شاعر و نثر نگار کے بارے پوچھتے رہے۔ میں نے جواب میں غالب کو پسندیدہ شاعر، مفتی جی اور قرۃ العین حیدر کے نام بطور نثر نگار بتائے۔ پہلے اور آخری نام کو سن کر معین صاحب نے سبحان اللہ اور ماشاءاللہ کے کلمات ادا کیے۔ معین صاحب کے جانے کے بعد ہم سب کلاس فیلوز دیر تک اُن کے بارے اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے۔ راحیلہ بولی بڑے سویٹ سے ہیں۔ سعید نے کہا بڑے گریس فُل لگ رہے تھے۔ فرزانہ نے اپنی مدھم سی آواز میں کہا معین صاحب کا چہرہ بڑا اکتابی سا ہے۔ پہلی کلاس کے بعد میں معین صاحب کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر اُن کو دفتر تک چھوڑنے آیا۔ بعد میں آنے والے دنوں میں ہمیشہ میں اُن کو کلاس سے دفتر تک چھوڑنے آتا۔

شعبۂ اُردو کے سامنے والے لان میں شعیب ہاشمی کے ہاتھوں لگائے ہوئے درخت کے ساتھ پڑی بنچوں پر ہم سب کلاس فیلوز صبح اکٹھے ہوجاتے اور معین صاحب کی آمد کا انتظار کیا کرتے۔ معین صاحب بخاری آڈیٹوریم والے گیٹ سے آتے۔ وہ ایک ہاتھ میں زنبیل کو تھامے چہرے پر مسکراہٹ سجائے خراماں خراماں املتاس کے درختوں تلے سے گزرتے ہوئے دفتر کی جانب بڑھ جاتے۔ ہم سب بھی اُن کے ساتھ دفتر وارد ہوجاتے اور کہتے کہ غالب کے مقابلے میں اقبال بڑا بورنگ شاعر ہے۔ معین صاحب کہتے بھائی دروازہ تو بند کردو اقبالیات کے پروفیسروں کی بھی اِدھر سے گزر ہوتی ہے۔ صبح صبح ہی بڑے دلچسپ فقرے سنا کرتے۔ معین صاحب ہماری باتوں، جو چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہوتی تھیں اُن کو بھی اپنی گفتگو کے ذریعے مثبت زاویہ عطا کردیتے اور ایک طرح سے شگفتگی۔

محکمہ تعلیم میں معین صاحب سب سے اعلیٰ گریڈ کے رتبے پر فائز تھے۔ دوسرے افسروں کی طرح نہ تو معین صاحب کے کپڑوں پر کلف ہوتا اور نہ ہی اُن کی شخصیت میں کوئی مغروری شامل تھی۔ نہ تو کوئی گفتگو میں طنطنہ ہوتا اور نہ ہی دوسرے افسروں کی طرح رعب اور دبدبہ اُن کی شخصیت کا عنصر تھا بلکہ وہ اپنے چپڑاسی کو بھی بابو خان صاحب کہہ کر مخاطب کرتے اور جب بھی کوئی کام کہتے تو خود شرمندہ شرمندہ سے ہوجاتے۔ اس زمانے میں معین صاحب کے علاوہ گریڈ اکیس کے اور کتنے افسر ہوں گے جو لیدر کی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں اور نہ ہی ٹھنڈے یخ اے سی والے کمرے کے سواد لیتے ہیں۔

ہاں ــــــ یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں۔

لڑکیاں کلاس پڑھنے کے بعد معین صاحب کے کپڑوں کے کلر پر بحث کرتیں، معین صاحب ہمیشہ شلوار قمیض پہنتے اور ساتھ گرمیوں سردیوں میں واسکٹ زیب تن کرتے۔ سکائی بلیو شلوار قمیض پر نیوی بلیو واسکٹ، کبھی ٹی براؤن شلوار قمیض پر کافی براؤن واسکٹ۔ نہ معین صاحب کے ماتھے پر کبھی کوئی بل دیکھا اور نہ ہی کپڑوں پر۔ کشادہ پیشانی پر سلور گرے سلجھے ہوئے بالوں میں وہ بڑے گریس فُل نظر آتے۔

جنید میرا بڑا مہربان اور قدیم دوست ہے۔ گرمیوں کی ایک رات وہ میرے گھر آیا۔ وہ سرگودھا ہو تو میری اکثر شامیں اُسی کے ساتھ گزرتی ہیں۔ گرمیوں کی ایک شام وہ پاؤں میں بے حد تکلیف کے باوجود میرے گھر محض گپ شپ کے واسطے آیا۔ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے دوسری کرسی پر پاؤں رکھنے کے لیے قریب لاتے ہوئے بولا۔ یار کلیار کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو ظاہری اور باطنی ہر دو صورت بے حد خوبصورت ہو۔ میں نے فوراً جواب دیا

ہاں ــــــ ہاں معین صاحب ہیں ناں!

☆☆☆

ایم خالد فیاض

سیّد معین الرحمٰن کی خاکہ نگاری

شخصی خاکوں پر مبنی مضامین کی سیّد معین الرحمٰن کی دو کتابیں اہم ہیں۔ ایک ''محبتیں ہی محبتیں'' اور دوسری ''چند عزیز اور حفیظ شخصیتیں'' کتابوں کے عنوانات سے ہی ظاہر ہے کہ معین الرحمٰن نے یہاں چند عزیز اور قابلِ احترام شخصیتوں سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ ''اعترافِ کمال بجائے خود ایک بڑی نیکی ہے، ایسی بڑی نیکی جس کی توفیق ہر شخص کے نصیب میں نہیں لکھی!'' (محبتیں ہی محبتیں، ص:۱۱۵) لہٰذا وہ کمال کا اعتراف دل کھول کر کرتے ہیں حتیٰ کہ اس محبت اور عقیدت کے اظہار میں وہ اپنی بیان کردہ شخصیتوں کی خوبیوں اور نیکیوں کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ ہمیں بھی ان شخصیات سے ایک گونہ عقیدت محسوس ہونے لگتی ہے۔ نظیر صدیقی صاحب نے ایک جگہ رشید احمد صدّیقی کے فن خاکہ نگاری کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے: ''رشید صاحب کا فن کسی شخصیت سے مسرور و متاثر ہو کر اسے ہماری آپ کی پسند کا موجب بنا دینے کا فن ہے۔'' (تاثرات و تعصّبات، ص:۳۰۹) اس حوالے سے معین الرحمٰن کی خاکہ نگاری کا فن رشید احمد صدّیقی کے قریب ہو جاتا ہے۔

اپنے ان خاکوں میں شخصیات کی خوبیوں کو عیاں کرنے اور نیک سیرتی کو بیان کرنے کے پس منظر میں شیخ منظور الٰہی کی وہ خیال افروز بات بھی شامل ہے جس نے معین الرحمٰن کے دامن دل کو کھینچا: ''کسی کے متعلق حسنِ ظن رکھنا اور اُس کا اظہار لبوں پر نہ لانا، گُن گنوانے میں بخل سے کام لینا (ہے)۔'' (چند عزیز اور حفیظ شخصیتیں، ص:۱۰)

شیخ منظور الٰہی کی اس بات سے تحریک پا کر معین الرحمٰن ایسی شخصیات جن کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کو بامعنی یا باثروت خیال کرتے ہیں اور جن کے بارے میں اُن کا خیال ہے کہ ''میری اپنی زندگی کچھ بھی نہیں، یہ عبارت ہے کچھ دوسری شخصیتوں سے۔'' (محبتیں ہی محبتیں، ص:۲۰) اور ''ان محبوب ہستیوں اور شخصیتوں کا ذکر بمنزلہ وظیفہ حیات ہے۔'' (ایضاً، ص:۲۰) لہٰذا وہ ان سیرتوں کے اُن تمام روشن پہلوؤں کو ہمارے سامنے لے آتے ہیں جن سے ہم اُن کے اعلیٰ کردار اور اوصاف سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔

معین الرحمٰن نے اپنے شخصی خاکوں کے لیے جن شخصیات کا انتخاب کیا ہے چونکہ وہ تمام کی تمام علمی و ادبی ہیں (سوائے ملک معراج خالد اور جنرل نیازی کے) لہٰذا ان خاکوں میں ہر طرف فضا بھی علمی و ادبی ہی چھائی ہوئی ہے اور زیادہ تر سیرتیں اپنے علمی و ادبی کاموں اور اُن سے شغف کے اظہار ہی سے کھلتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''ہر خوب صورت چیز، ہر اچھا خیال، ہر لطیف جذبہ انہیں اپیل کرتا ہے۔ پھول

اور پتھر، شعراورادب، مصوری، خطاطی، ذوق کی نفاست، احساس کی لطافت، شرافت، تناسب، اخلاص، محبت، وہ ان سب اعلیٰ تہذیبی قدروں کا حسین اور لطیف مرکب تھے۔'' (آل احمد سرور، محبتیں ہی محبتیں، ص:۱۵۰)

''اُن کا سا پاسِ وضع، اُن جیسا وسیع مطالعہ، اُن کا سا احساسِ جمال، پرفیکشن کی جستجو اور احتیاط اور اُن کا اُسلوبِ اظہار، میں نے اُن کے ہم عصروں میں کم کم پایا۔'' (خواجہ منظور حسین، ایضاً، ص:۱۳۷)

''اُردو زبان وادب کے اکابر واصاغر اور ادبیات ہندوسند، کا کوئی گوشہ ہی ایسا ہوگا کہ اُن کی توجہ سے محروم رہا ہو۔'' (فرمان بھائی، ایضاً، ص:۴۳)

''حقیقت یہ ہے کہ ہم عصر اہلِ قلم میں کم ہی مدیر ایسے ہوں گے جو اپنی روش تحریر اور اندازِ قدیا قلم سے طفیل صاحب کی طرح پہچانے اور پکڑے جاسکتے ہوں۔'' (محمد طفیل، ایضاً، ص:۱۵۹)

''شعر کے لیے اور شعر ہی پر کیا موقوف، کسی بھی نوع کے بڑے فن پارے کی تخلیق کے لیے جو استغراق اور انہماک چاہیے، حفیظ اُس کی مجسم تصویر تھے۔'' (حفیظ جالندھری، ایضاً، ص:۱۷۲)

علم وادب سے وابستہ شخصیات کی وجہ ہی سے ہمیں جگہ جگہ معین الرحمٰن کی تنقیدی آرا سے بھی واسطہ پڑتا ہے جن کی اہمیت اور قدر و قیمت سے انکار ممکن نہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

''رسمی سند کے لیے لکھی گئی یا پیش کی گئی کتابیں بھی دل پذیر ہوسکتی ہیں، بشرطیکہ لکھنے والا قلب وقلم کے گداز اور امتیاز کا مالک اور فکر وبصیرت کا حامل ہو۔'' (آل احمد سرور، ایضاً، ص:۱۴۵)

''سب اچھا لکھنے والے، یہاں کے ہوں یا کہیں کے ___ کل کے ہوں یا آج کے، قابلِ احترام ہیں اور اس وجہ سے کہ کل کے ہیں، یا محض اس وجہ سے کہ آج کے ہیں، قابلِ لحاظ نہیں ہوسکتے۔۔۔۔ اصل چیز جوہر ذاتی ہے جس پر کسی کا یا کہیں کا اجارہ نہیں۔'' (حفیظ جالندھری، ایضاً، ص:۱۷۴)

''نقاد حلقوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ برادری سے باہر کسی پر اُن کی نظر ہی نہ ٹکتی ہو یا وہ ہوا کا رُخ دیکھنے کے عادی ہوگئے ہوں اور مصلحت کوش ہو چکے ہوں۔ ایسے میں خودستائی معیوب تو کیا مستحسن ہے۔'' (نظیر صدیقی، ایضاً، ص:۱۷۹)

اب ایک اقتباس ''زبان'' کے حوالے سے ہے۔ اگرچہ کچھ طویل ہے مگر تنقیدی نقطۂ نظر سے اہمیت کا حامل ہے۔ لکھتے ہیں:

''زبان کسی خاص مذہب یا مسلک والوں کی ہوتی ہے، نہ زبان کا کوئی مذہب ہوتا ہے، نہ اس پر کسی خاص خطے یا علاقے کا حق فائق کہا جاسکتا ہے۔ جو اسے برتے گا اور اس میں محنت کرے گا، اُسے عزیز رکھے گا اور اُس کی آبیاری کرے گا قابلِ عزت ہوگا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ثابتہ ہے کہ کوئی بھی زبان، وہ کسی معاشرے کے خون اور خمیر ہی میں کیوں شامل نہ ہو، اگر EconomicBased نہیں اور اس زبان کو برتنے والوں کو مضبوط معاشی بنیاد اور آسانیاں یا قابلِ لحاظ سماجی رتبہ فراہم نہیں کرتی تو اس کی عمومی اہمیت اور اُس کی جانب علمی توجہ بتدریج کم ہوگی۔'' (گپتا رضا اور علی سردار جعفری، چند عزیز اور حفیظ شخصیتیں، ص:۲۶۳-۲۶۴)

ڈاکٹر صابرہ سعید نے ''اُردو ادب میں خاکہ نگاری'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ''خاکے کا مواد ذاتی معلومات کے علاوہ خطوط، شاعری، تصانیف، محاضرات اور اقوال سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔'' (بحوالہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری، ''سعادت حسن منٹو۔ پچاس برس بعد''، ص:۶۰) ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کے ہاں اس کا پورا پورا اہتمام نظر آتا ہے۔ وہ شخصیت نگاری کے فن میں خطوط، آپ بیتی، مضامین، فرمودات حتیٰ کہ گواہیوں کے ذرائع کا بھی بھرپور استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر خطوط ایسا ذریعہ ہیں جن سے شاید ہی کوئی خاکہ محروم رہا ہو۔ اُن کا اس بات پر ایقان ہے کہ ''خطوں کو کسی شخصیت کے عرفان کا سب سے اہم وسیلہ اور ذریعہ مانا گیا ہے۔'' (چند عزیز اور حفیظ شخصیتیں، ص:۳۷۰) لہٰذا وہ شخصیت نگاری میں خطوط کا سہارا لیے بغیر نہیں رہتے۔ حتیٰ کہ کچھ خاکے ''چند عزیز اور حفیظ شخصیتیں'' میں ہیں ہی خطوط کا مجموعہ۔ مثلاً پروفیسر محمد عثمان (ص:۳۷۰ تا ۳۷۵) اعجاز حسین بٹالوی (ص:۱۲۶ تا ۱۳۹) ضمیر نیازی (ص:۱۰۲ تا ۱۱۶) جگن ناتھ آزاد (ص:۲۲۱ تا ۲۳۳) وغیرہ کے خاکے۔ ان خطوط کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ممدوح کا اُسلوب نگارش بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے اور اگر یہ درست ہے کہ اُسلوب، شخصیت کا دوسرا نام ہے تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان خطوط کے ذریعے شخصیات کے بہت سے ان دیکھے جہان بھی ہم پر واضح ہوسکتے ہیں۔

خطوط کے علاوہ آپ بیتی اور خودنوشت مضامین سے بھی معین الرحمٰن شخصیت نگاری میں جا بجا مدد لیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو ذرائع اور، جو انہوں نے استعمال کیے ہیں اُن میں سے ایک فرمودات کا ہے۔ سرفراز اقبال کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے انہوں نے اقوال وفرمودات پر بہت بھروسہ کیا ہے۔ (چند عزیز اور حفیظ شخصیتیں، ص:۱۶۰ تا ۱۸۲) دوسرا ایک ذریعہ گواہی کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے اعلیٰ اور بھرپور نمونہ نظیر صدّیقی کے خاکے کا ہے۔ (محبتیں ہی محبتیں، ص:۱۸۰ تا ۱۸۶) یہ خاکہ اگر دوسرے تمام خاکوں پر برتری حاصل کرگیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہی ہے کہ معین الرحمٰن نے یہاں نظیر صدیقی

کی اہلیہ فرحت پروین ملک کی گواہی کو جو ''آدھا مسلمان'' کے عنوان سے ریکارڈ ہوئی تھی، شامل کرلیا ہے اور اس گواہی نے نظیر صدیقی کی شخصیت کو جو اوریجنلٹی عطا کی ہے اُس سے یہ واقعی خاکہ بن گیا ہے۔

شخصیت نگاری کے یہی ذرائع ہیں (بالخصوص خطوط) جن کی بدولت معین الرحمٰن نے ''محبتیں ہی محبتیں'' میں اُن شخصیات کے خاکے بھی قلم بند کردیئے (رشید احمد صدیقی، ایم آر کیانی، مالک رام، کالی داس گپتا رضا اور محمد خالد اختر) جنہیں وہ کبھی نہ ملے۔ جنہیں، انہوں نے بن دیکھے چاہا اور آئیڈیلائز کیا۔

خاکہ نگاری کے دوران ممدوح کی شخصیت پر تو روشنی پڑتی ہی ہے، خاکہ نگار کے اعتقادات اور زندگی کے بارے میں اُس کے زاویۂ نگاہ سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ہم کچھ ایسے تراشے پیش کریں گے جن سے معین الرحمٰن کے اعتقادات وایقان اور اُن کے بنیادی انسانی زاویۂ نگاہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مثلاً

> ''حُسن، جمال، ذہانت اور تناسب سے وہ متاثر ہوتے ہیں، بدمست یا بے لگام نہیں۔'' (فرمان بھائی، محبتیں ہی محبتیں، ص:۴۴)
>
> ''کوئی شخص نہ محض کمزوریوں کا مرکب ہوتا ہے، نہ سراسر خوبیوں کا مرکز۔ فرمان صاحب کی نظر خوبی پر جاتی ہے اور صرف خوبی پر ہی رہتی ہے۔'' (ایضاً، ص:۴۵)
>
> ''وقارِ عظیم صاحب کی زندگی بڑی مشقت اور جدوجہد کی زندگی تھی۔ وہ آخر عمر تک بڑے فعال رہے۔ پڑھنا لکھنا، اُن کے روزمرہ کے معمولات کا جزو لازم تھا اور اس میں اُن کا بڑا جی لگتا تھا۔ دن بھر میں وہ پندرہ سولہ گھنٹے مصروفِ کار رہتے تھے۔'' (وقار عظیم، ایضاً، ص:۱۲۲تا۱۲۳)
>
> ''انسانوں سے پیار وقار عظیم کے مزاج کا ایک حصہ تھا اور یہ حصہ سارے کا سارا انہوں نے دوسروں میں بانٹ دیا تھا۔'' (ایضاً، ص:۱۲۵)
>
> ''وہ صلے اور ستائش دونوں سے بے نیاز، نمود ونمائش کی دنیا سے دُور، مسرت اور بصیرت کے خزانے لٹاتے رہے۔'' (خواجہ منظور حسین، ایضاً، ص:۱۴۰)
>
> ''چھوٹوں کی بات کو یاد رکھنا اور اہمیت دینے کے اس رویے میں، میں سُرور صاحب کی شخصیت کی موہنی اور بڑائی، دل کشی اور رعنائی کو مضمر اور جلوہ گر پاتا ہوں۔'' (آل احمد سُرور، ایضاً، ص:۱۴۵)
>
> ''آل احمد سُرور روشن اور بیدار فکر اور ذہن رکھتے تھے۔ اپنے عہد سے آگاہی اور اُن پر نظر، تنگ نظری، تعصب اور تلخی سے دوری، مزاج کی نرم روی، دھیما پن اور وسعتِ قلبی، اُن کی شناخت اور پہچان ہے۔'' (ایضاً، ص:۱۴۶تا۱۴۷)

> ''اُن کا ایقان اور عقیدہ یہ تھا کہ سچے الفاظ کبھی بوڑھے یا بے جان نہیں ہوتے۔'' (محمد طفیل، ایضاً، ص:۱۶۲)
>
> ''نظیر صدیقی نے شکستِ ذات کی قیمت پر فراخی رزق کا سودا کبھی نہ کیا۔ اس میں اُن کی بڑائی اور جیت ہے۔'' (نظیر صدیقی، ایضاً، ص:۱۷۸)
>
> ''وہ کفایت لفظی کے ساتھ، موقع ومحل کی مناسبت اور مطابقت سے اچھا، شائستہ، موثر اور مغز ومعنویت سے بھرپور جملہ اختراع کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔'' (پروفیسر حمید احمد خاں، چند عزیز اور حفیظ شخصیتیں، ص:۸۱)

سیرتوں کو بیان کرتے ہوئے معین الرحمٰن بعض جگہوں پر زندگی اور انسانوں کے گونا گوں پہلوؤں کے متعلق اپنی ذاتی آراء بھی قائم کرتے چلے جاتے ہیں جو انسان کے لیے نصیحت کا کام دیتی ہیں لیکن ان نصیحتوں میں چونکہ اُن کے مشاہدے، تجربے اور فکر کا رنگ شامل ہے اس لیے یہ محض خشک اور جامد نصیحتیں بن کر نہیں رہ جاتیں بلکہ آفاقی سچائیوں کا درجہ حاصل کرکے ذہن وشعور کو جلا بخشنے میں معاون ہوتی ہیں جس سے پڑھنے والے پر ایک خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ حکمت کی ان باتوں کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ فرمائیے:

> ''سوال کرو اگر ابہام رفع کرنا مقصود ہے، یا راستہ پانا ہے ___ لیکن شوخی یا سرکشی سے استاد کو الجھانا، ناملائم اور غیر مہذب بات ہے۔ اگر کسی استاد سے محبت نہیں اور آپ اس کی دل سے عزت نہیں کرتے تو اس سے کچھ سیکھ اور پا بھی نہیں سکتے۔'' (مولوی عبدالحق، محبتیں ہی محبتیں، ص:۱۰۶)
>
> ''اپنی ساری ذہنی اور فکری ترقیوں کے باوجود یہ راز انسان نہیں پا سکا کہ کچھ لمحے، کچھ موڑ اور مواقع اور نام معلوم نہیں کیسے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کیوں، اُس کی زندگی میں کلک کر جاتے ہیں ___ اور پھر مابعد زندگی کے سارے طویل اور بہت سی صورتوں میں کثیف برسوں پر وہ کیوں ابرِ رحمت کی طرح چھا جاتے ہیں؟'' (وقار عظیم، ایضاً، ص:۱۱۸)
>
> ''انسان کا سب سے بڑا اعزاز وہ ہے جو دوسرے انسان کے دلوں میں جاگزیں ہوجائے۔'' (ایضاً، ص:۱۲۵)
>
> ''رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ انسان کی سیرت اور شخصیت کا بھید جتنا مصیبت اور بیماری میں کھلتا ہے اور کہیں نہیں کھلتا۔ مصیبت اور بیماری میں کسی طرح کا ملمّع قائم نہیں رہتا۔ جب سارے دوسرے سہارے ٹوٹ چکے ہوں اُس وقت بھی اپنا سہارا پکڑے رہنا بڑا کٹھن کام ہے۔'' (ایضاً، ص:۱۳۳)

''میرا ایمان ہے کہ دھول اور گرد و غبار کا مقدر دب جانا اور معدوم ہو جانا ہے۔
خوبی، غالب آ کر رہتی ہے۔'' (حفیظ جالندھری، ایضاً، ص:۱۷۳)

چند خاکوں کے سوا باقی تمام خاکے شخصیات کی موت پر لکھے گئے ہیں جس سے ان خاکوں میں رثائی درد و سوز کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ خاکوں میں موت سے پہلے ممدوح کے آخری ایام کا ذکر بھی ہوا ہے خاص طور پر وقار عظیم کے آخری ایام کا ذکر بڑا تفصیلی ہے اور جو بڑا پُر درد اور پُر اثر بھی ہے۔ ان خاکوں میں سوانحی عناصر بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔ تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور دیگر مصروفیات اور کارِ زندگی کے سنین درج کیے ملتے ہیں جس سے یہ خاکے سوانحی مزاج کے بھی حامل ہو گئے ہیں۔

اگرچہ معین الرحمٰن کی یہ تحریریں خاکہ نگاری کے فن کے جدید تصور پر پوری نہیں اُترتیں اور انہیں فن کے جدید آداب و معائر پر جانچنا چاہیے بھی نہیں کیونکہ ان تحریروں کا مقصود بالذات سیرت کشی قطعاً نہیں ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تحریریں خاکہ نگاری کی سب خوبیوں سے خالی ہیں۔ ان میں شخصیات کے کلیدی پہلوؤں کی طرف ایسے ضروری اشارے یقیناً موجود ہیں جن کی مدد سے سیرت کے وہ گوشے ضرور نمایاں ہو جاتے ہیں جن سے مرقع نگار متاثر ہوا ہے۔ اُسلوب احمد انصاری نے مرقع نگاری کی ایک صفت یہ بیان کی ہے کہ ''ممدوح۔۔۔ کی سیرت کے اُن گوشوں کو نمایاں کرنا، جن سے مرقع نگار متاثر ہوا ہے۔'' (نقد عبدالحق، ص:۲۲۸) ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیّد معین الرحمٰن مرقع نگاری کے اس وصف کے حوالے سے پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

ان خاکوں کا اُسلوب گھٹا ہوا، شگفتہ اور دل پذیر ہے۔ محاوروں کی چاشنی، برمحل تراکیب کا استعمال اور لب و لہجے کی بے ساختگی اور اُس کا رچاؤ تحریر میں نہ صرف روانی پیدا کرتا ہے بلکہ نثر کو ایک خاص قسم کا حُسن بھی عطا کرتا ہے جسے ہم صرف و محض معین الرحمٰن سے ہی منسوب کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

انٹرویو: ثروت حسنین عامر

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کا آخری انٹرویو

سوالنامہ برائے مقالہ ''پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ کی صحافت اور شخصیت''

سوال۱: بہ حیثیت بڑے بھائی کے آپ کو ان کا ساتھ کیسا لگتا ہے؟

جواب: ایسا ہی جیسا کسی خوش سرشت چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کا ساتھ لگنا چاہیے۔

سوال۲: آپ اور وہ ہر قدم پر ساتھ ہوتے تھے۔ اسکول، کالج دونوں جگہ آپ دونوں کے مضامین مشترک تھے۔ کہیں یہ خیال آیا کہ بھائی کی پسند سے ہٹ کر کام کروں؟

جواب: ہم دونوں کے مضامین اسکول اور کالج، ہر دو مدارج میں ''مشترک'' رہے اس لیے کہ مضامین کا انتخاب، متین بھائی کی ترجیح اور خوشی پر منحصر ہوتا تھا۔ جو مضامین اُنہیں بھاتے، وہی مجھے رکھنے ہوتے تھے تاکہ کتابوں کا ایک ہی سیٹ خرید کر ہم دونوں اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ اسکول اور کالج کے ابتدائی مدارج میں اتنی ''معاشی'' سہولت میسر نہیں تھی کہ الگ الگ مضامین کی کتابیں خریدنے کی ''عیاشی'' میں مبتلا ہو سکتے! مجھے ''معاشیات'' اور ''جغرافیے'' کے مضمون سے رغبت نہیں تھی لیکن متین بھائی کو یہ پسند آئے تھے۔ مجھے بھی یہی لینے پڑے۔ اِسے آپ حالات کا جبر قرار نہ دیں، چھوٹے بھائی کی ''سعادت مندی'' سے تعبیر کریں تو میں اسے آپ کی صحافیانہ ''ثروت مندی'' جانوں گا۔

سوال۳: پاکستان بننے کے بعد جن حالات میں آپ بھائی کے ساتھ رہے، اب آپ اس وقت کو سوچتے ہیں تو ذہن میں کیا خیال آتا ہے؟

جواب: بھئی! یہ تو آپ اُن سے پوچھیں جو آپ کے تھیسس کا موضوع ہیں۔ خاکم بدہن ہم پر کوئی تھیسس لکھے اور وہ ہم سے یہ سوال کرے پھر کہیں (اور سُنا کرے کوئی!) تو کچھ اچھا بھی لگے۔ اس سوال سے آپ کی مراد اگر پاکستان کی ہجرت کے شب و روز سے ہے تو متین بھائی کے دل گداز اور خوں چکاں ہجرت نامے ''میں نے پاکستان بنتے دیکھا'' پر کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ یہ تحریر قیامِ پاکستان کے حوالے سے زندہ رہنے والی ایک سمت نما دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بطور صحیفۂ نئی نسل کے زیرِ مطالعہ رہنی چاہیے۔

سوال۴: بھائی نے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا اور آپ نے ادبی اُسلوب اپنایا اس میں بھائی کی رائے شامل تھی یا نہیں؟

جواب: متین بھائی کو یونیورسٹی میں باقاعدہ داخل ہو کر پڑھنے کی آسانی اور سہولت حاصل ہوئی۔ وہ اُس

زمانے میں ایک تعلیمی ادارے میں شام کی کلاسز کی تدریسی خدمت پر مامور تھے۔ صبح کے وقت وہ فراغت کے باعث یونیورسٹی جا سکتے تھے۔ میں اُن دنوں آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس حکومتِ سندھ کے ایک دفتر میں برسرِ کار تھا۔ صبح کی ملازمت کے باعث یونیورسٹی میں ریگولر کلاسز جائن نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے بطور ''ایکسٹرنل'' اُمیدوار کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اُردو) کیا۔ جرنلزم میں پرائیویٹ امتحان لازمی عملی تربیت کے باعث ممکن نہ تھا، ورنہ ضرور متین بھائی کے ''زیرِ اثر'' صحافت میں ایم اے کرنا ہی میرا مقسوم ہوتا! اُردو کالج، کراچی میں بی اے کے زمانے میں بابائے اُردو سے ہمارا رابطہ ہو چکا تھا اور یہ ایسا قوی ہوا کہ ایم اے (اُردو) کرنے کی ٹھانی۔ اَب پلٹ کر دیکھتا ہوں تو بہت مطمئن ہوں کہ ''صحافت'' سے ''عملی تربیت'' کی شرطِ لازم نے بچایا اور میں اُردو میں ایم اے کر سکا اور اس میدان میں اپنے لیے ''آزادانہ'' کوئی جگہ بنا پایا۔

سوال۵: بھائی کو آپ نے کس حد تک انسان دوست اور ہمدرد پایا؟

جواب: ''کس حد تک'' کی قید کیا، بھئی! ہمارے لیے اُن کا ساتھ، اُن کی رفاقت اور شفقت کی تو کوئی حد ہے، نہ انت!!

سوال۶: اگر آپ بھائی کی حیثیت کے علاوہ پروفیسر متین الرحمٰن کی صحافتی، تدریسی زندگی کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں تو کیا کہیں گے؟

جواب: یہ بڑی مہربانی کہ اس سوال کا جواب دینے کے لیے آپ نے مجھے ''پابند'' نہیں کیا، اِسے میری صوابدید پر چھوڑ دیا ہے، یعنی: ''کچھ کہنا چاہوں تو۔۔۔'' پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف انگلش، گورنمنٹ کالج میانوالی کے پروفیسر منور علی ملک صاحب نے ۱۹۹۵ء میں میرے ''ادبی معمولات اور معتقدات'' کے بارے میں ایک خاصا طویل انٹرویو کیا تھا، جو میری تالیف ''دل کی بات'' (مرتبہ: انبساط امین عباسی، لاہور، جنوری ۲۰۰۰ء) میں شامل ہے، اُن کے ایک سوال: ''معاصر صحافتی نثر نگاروں میں آپ کا انتخاب؟'' کے جواب میں جو کچھ کہا تھا، اُسے یہاں دہرائے دیتا ہوں: ''اداریہ نویسی اور تجزیاتی و دستاویزی صحافتی نثر میں، میں محمد صلاح الدین اور متین الرحمٰن مرتضیٰ کو بڑا اونچا درجہ دیتا ہوں۔ کالم نگاری میں مولانا نصر اللہ خاں، ابن الحسن، جمیل الدین عالی، ابنِ انشا، مشفق خواجہ، عطاء الحق قاسمی، محمد علی صدیقی اور ضمیر نیازی کے ارتعاشاتِ قلم کا میں بے حد معترف ہوں۔'' ان میں ایک مشفق خواجہ ہیں جو جیتے جی کالم نگاری سے تائب یا دُور ہو چکے۔ معاصر صحافتی نثر نگاروں میں، اس وقت مجیب الرحمٰن شامی اور ارشاد احمد حقانی کے نام بھی ذہن میں جگمگاتے ہیں۔

سوال۷: بھائی کی شخصیت کا کون سا پہلو ایسا ہے جس کے بارے میں کہنے سے ہچکچاتے ہیں؟

جواب: ''اچھے پہلوؤں'' کا تو مشتہر کرنا مستحق ہے، انہیں مستور نہ رہنا چاہیے، لیکن کسی بھلے آدمی کو، کسی

''بھلی تر''، شخصیت کے کسی کمزور پہلو کے بارے میں کوئی بات کہنے میں ضرور ہچکچانا ہی چاہیے۔ کمزوریاں کس ابنِ آدم کی ہمزاد نہیں ہوتیں؟ ___ ''انسانی ذہن اور آئندہ نسل میں انسانوں کی فضیلت ہی کی یاد باقی رہے تو اچھا ہے۔ اس لیے کہ بُرے اور بدنیت شخص، بڑے اور اچھے لوگوں کی تمام خوبیوں سے منہ موڑ کر اُن کی صرف ایک آدھ کمزوری کو اپنی بداعمالی اور بے راہ روی کے لیے چُن لیتے ہیں۔'' رشید احمد صدیقی ہی کے بقول: ''کسی کے عیب نکالنے سے بہتر مشغلہ چپ رہنا ہے اور دونوں سے بہتر اُس کی خوبیوں کو ظاہر کرنا ہے۔''

سوال۸: اب آپ بھی ریٹائرڈ ہیں اور بھائی بھی، جب ملتے ہیں تو کیا احساسات ہوتے ہیں؟ پچھلے برسوں کو یاد کرتے ہیں؟

جواب: یہ کس نے کہا، یا آپ نے کیسے قیاس کر لیا کہ ہم دونوں ''ریٹائر'' ہو چکے؟ ''ریٹائر'' تو وہ ہوتا ہے یا اُسے سمجھنا چاہیے جو ''از کار رفتہ'' ہو چکا ہو۔ متین بھائی کے بھرپور شب و روز تو سب آپ کے سامنے ہیں؟ میں کیا کہوں ___ میری مصروفیت کا عالم نہ پوچھیے۔ ''قیدِ سرکار'' سے ''آزادی'' پا جانے کے بعد میری مصروفیتِ کار گھٹی نہیں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اپنے شوق کے لکھنے پڑھنے کے کام جو منصبی مصروفیت کے باعث التوا میں پڑے تھے، اُن کی طرف توجّہ، مختلف یونیورسٹیوں کی مشاورتی کمیٹیوں کی ذمہ داری ایم فل، پی ایچ ڈی (اُردو) کے داخلوں کے پینل پر موجودگی، تحقیقی کاموں کی نگرانی، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کی جانچ پرکھ کے فرائض، ان کے ''وائیوا'' کئی یونیورسٹیوں کے ریسرچ جرنلز کے مشاورتی بورڈ کے رکن کے طور پر اشاعت کے لیے آنے والے تحقیقی مقالات کی قدر پیمائی، بعض علمی اور ادبی جرائد کے لیے مشاورتی اور انتخابی کام ___ ''برسرِ کارِ سرکار'' ہوتے ہوئے بعض فرمائشی کاموں سے معذرت کر لیتا تھا، اب کیا عذر لاؤں؟! لیکن ناحق یہ میں کدھر چل نکلا ___ یہ باتیں تو کسی اُس معصوم (=کم عقل) ریسرچ اسکالر کے سوال کے جواب میں کرنے کی ہیں جسے تحقیق کے لیے ڈھنگ کا کوئی موضوع نہ ملے اور اُسے مجھ پر لکھنا پڑے۔

سوال۹: بھائی کا ذکر کسی ایسی جگہ پر ہو رہا ہو جہاں لوگ یہ نہ جانتے ہوں کہ آپ کا ان سے کیا تعلق ہے تو کیسا لگتا ہے؟

جواب: ایسا اتفاق گو کم ہی ہوا ہوگا ___ ردِعمل کا تعلق ''ذکر'' کی نوعیت سے جڑا ہوا ہے۔ ''ذکرِ خیر'' ہو رہا ہو تو چاہوں گا کہ یہ طول پکڑے! شاید یہ بتانے اور جتانے کو بھی جی مچلے کہ مجھے بھی اُن سے نسبت ''دُور'' کی نہیں قریب کی ہے۔ ''ذکرِ ناگوار'' پر، اگر یہ کسی جگہ ہو رہا ہو، میں موضوع کو بدلنے یا ''واش آف'' کر دینے کی کوشش کروں گا۔

☆☆☆

جمشید چشتی

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی نذر

روئے ہیں اور مسکرائے ہیں
لوگ جتنے جہاں میں آئے ہیں

تُو نے بس دشمنوں کے سنگ نہیں
دوستوں کے بھی تیر کھائے ہیں

ایسا ثابت قدم تھا تُو ، جس پر
حوصلے سب نے آزمائے ہیں

ایک تیری منڈیر ہے ، جس پر
آندھیوں نے دیئے جلائے ہیں

تُو نے غالبؔ کے عشق میں شب بھر
کتنے آفاق جگمگائے ہیں

تجھ سے رشتہ نہیں ، مگر جمشیدؔ
تعزیت کے لیے ہم آئے ہیں

☆☆☆

بدر منیر الدین

ڈاکٹر معین کے لیے ایک غزل

تری آنکھوں سے میں خود پر عیاں ہونے لگا تھا
مجھے بھی اپنے ہونے کا گماں ہونے لگا تھا

میں اپنی ذات کا صحرا جو تیرے پاس لایا
مرے اندر بھی بارش کا سماں ہونے لگا تھا

عطا ہم کو ہوئی صد شکر تھوڑی سی اداسی
وگرنہ مفت میں جی کا زیاں ہونے لگا تھا

بھلا پھر کس طرح ممکن تھا خود کو یاد رکھتے
تمہارا نام جب وردِ زباں ہونے لگا تھا

کہاں جاتے ہماری آنکھ سے آنسو نکل کر
یہ پانی دل پہ ہی سنگِ گراں ہونے لگا تھا

☆☆☆

متعارفہ: ڈاکٹر سیّد معین الرّحمٰن

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے چار قدیم اور نادر خطوط

آج کی نشست میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی[1] (ولادت: ۹/اگست ۱۹۲۷ء، وفات: علی گڑھ، یکم جون ۱۹۷۸ء) کے چار خط پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ چاروں خطوط میرے ذخیرۂ مکاتیب میں محفوظ ہیں۔ خطوں کی تفصیل یہ ہے:

پہلا خط: مورخہ ۱۶/فروری ۱۹۴۹ء دوسرا خط: ۶/مئی ۱۹۵۵ء
تیسرا خط: ۳۰/اکتوبر ۱۹۵۸ء چوتھا خط: ۳/اگست ۱۹۶۷ء

یہ خط ۳۷ سے ۵۵ برس پرانے ہیں اور ان معنی میں نادر ہیں کہ پہلی بار طباعت کی روشنی میں آ رہے ہیں۔ پہلا خط ۱۹۴۹ء کا ہے جب اعظمی صاحب نے ابھی بی اے نہیں کیا تھا اور مجھے نہیں یقین کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا اس سے پہلے کا کوئی خط اب محفوظ ہو۔

یہ چاروں خط قاضی نذیر احمد (ولادت: ۱۹۲۸ء) کے نام ہیں۔ قاضی نذیر احمد اور خلیل الرحمٰن اعظمی دونوں نے انٹرمیڈیٹ ۴۷-۱۹۴۵ء کے سیشن میں علی گڑھ سے کیا۔ انٹرمیڈیٹ میں ''عربی'' دونوں کا ایک مشترکہ نصابی مضمون تھا۔ اعظمی صاحب ''مارلین ہال'' (علی گڑھ) میں رہتے تھے اور قاضی صاحب کی (جو اصلاً چنیوٹ ضلع جھنگ کے رہنے والے تھے) رہائش وی ایم (وقار الملک) ہال میں تھی۔ شام کو دونوں ایک ساتھ سیر کو جاتے اور معمولاً ''کیفے ڈی جمیل'' میں چائے پیتے۔

قیامِ پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد خلیل الرحمٰن اعظمی علی گڑھ ہی میں رہ بس گئے اور قاضی نذیر احمد کو جوانٹر کا امتحان دے کر تعطیلات میں علی گڑھ سے چنیوٹ میں آئے ہوئے تھے، واپس علی گڑھ جانا نصیب نہ ہوا۔ اُنھوں نے ۱۹۴۹ء میں بی اے گورنمنٹ کالج لائل پور سے کیا، ۱۹۵۲ء میں پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کی سند لی اور ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کر کے وہ محکمۂ تعلیم حکومتِ پنجاب سے وابستہ ہوئے۔

قاضی نذیر احمد کی مدتِ ملازمت کا زیادہ عرصہ گورنمنٹ کالج سرگودھا اور جوہر آباد میں بسر ہوا۔ شعبۂ پوسٹ گریجویٹ، شعبۂ اسلامیات کے چیئرمین کے طور پر وہ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں بھی برسرِ کار رہے۔ وہ گورنمنٹ کالج چکوال، نارنگ منڈی اور شرق پور میں پرنسپل اور ۱۹۸۳ء سے اپنی ریٹائرمنٹ ۱۹۸۸ء تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبۂ اسلامیات کے صدر رہے اور یہاں مجھے اُن کے رفیقِ کار ہونے کی عزت حاصل رہی۔ ۱۹۸۸ء سے وہ مستقلاً لاہور ہی میں رہ بس گئے ہیں اُن کے فرصت کے سب لمحات مطالعے میں بسر ہوتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی اور قاضی نذیر احمد ۱۹۴۷ء کے بعد سے ایک دوسرے سے نہیں مل سکے لیکن ان دونوں کے درمیان مراسلت اور موانست کا سلسلہ اور رشتہ وقفے وقفے سے برابر جاری رہا۔ امتدادِ زمانہ کے ہاتھ اعظمی صاحب کے صرف چار خط محفوظ رہ سکے۔ کچھ خطوں کے کچھ حصے آب زدگی کے باعث ضائع ہوئے اور انہیں نقطوں کے ذریعے......خالی چھوڑ دینا پڑا۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی انتقال (۱۹۷۸ء) کے بعد پچھلی ایک صدی میں ہماری ادبی یادداشت سے اُترے نہیں ہیں۔ اُن کی کئی کتابوں کے ایک سے زیادہ ایڈیشن چھپے ہیں۔ ان پر ایم فل (اُردو) اور پی ایچ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام ہوا (پاکستان میں بھی بھارت میں بھی)۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے حال ہی میں (مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۰) ''مضامین خلیل الرحمٰن اعظمی'' جلد اوّل شائع کی ہے۔ مضامین کا یہ انتخاب، اعظمی صاحب کے دوست پروفیسر شہریار (علی گڑھ) نے کیا ہے یہ پہلی جلد کلاسیکی ادب سے متعلق نو (۹) مضامین پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ معاصر ادب کے مطالعوں پر مبنی ہوگی۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن کے چار نادر خط ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

[۱]

گرامی نامہ خلیل الرحمٰن اعظمی، بنام: قاضی نذیر احمد

سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنّفین، علی گڑھ — ۶-امیر نشان،
۱۶ر فروری ۱۹۴۹ء — سول لائنس، علی گڑھ

عزیز دوست (نذیر احمد)!

کچھ دن ہوئے تمہارے دو کارڈ ایک ساتھ ملے تھے جس کے پڑھنے کے بعد جو خوشی حاصل ہوئی، اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ میں ان خطوں کا کتنا ممنون ہوں جس نے مجھے ایک بچھڑے ہوئے ساتھی سے ملا دیا۔ مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب تم وی ایم سی ماریسن کورٹ مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے اور ساتھ گھومنے جایا کرتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد چاہے دوسروں کو کتنا ہی فائدہ حاصل ہوا ہو لیکن ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، ہمارے درمیان ایک دیوار حائل ہو گئی۔ نہ جانے کتنے ساتھیوں کو اسی طرح کی تقسیم نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہوگا۔

۱۵ر اگست کے بعد مجھے پر کیا گزری، یہ ایک مفصّل کہانی ہے، بس اتنا سُن لو کہ دہلی کے فسادات میں، زخمی کر کے پھینک دیا گیا تھا، آٹھ زخم آئے تھے۔ تین ماہ اسپتال میں رہا۔ اس کے بعد پھر علی گڑھ آیا۔ اُس وقت سے یہیں پر ہوں۔ اب کی بار میں ہوسٹل میں نہیں رہتا بلکہ معین احسن جذبی صاحب[۲] جو اُردو کے لکچرر ہیں، اُن کے ساتھ رہتا ہوں۔

بی اے میں میرے پاس فلسفہ اور اکنامکس ہے۔ امتحان بہت قریب ہے لیکن پڑھائی لکھائی کچھ نہیں ہوتی ہے، دعا کرو کہ کامیاب ہو جاؤں۔ میں نے ادھر بہت سی نظمیں لکھیں جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئیں۔ مارچ کے ''ادبِ لطیف''[۳] میں بھی ایک نظم شائع ہو رہی ہے، تمہاری نظر سے گزرے گی۔ اپنی خیریت سے مطّلع کرتے رہو، وہاں تمہاری زندگی کیسی گزر رہی ہے۔

تمہارا
خلیل الرحمٰن اعظمی

[۲]

گرامی نامہ خلیل الرحمٰن اعظمی، بنام: قاضی نذیر احمد

۵-حالی روڈ، علی گڑھ
۶ر مئی ۱۹۵۵ء

میرے بہت اچھے دوست (نذیر احمد)!

عرصے کے بعد تمہارا ایک خط رشید صاحب[۴] کی معرفت ملا۔ کیا بتاؤں کس قدر خوشی ہوئی۔ تمہاری صورت اس وقت آنکھوں کے سامنے ہے، وہی معصومیت وہی.........[۵] ساتھ تمہارا بے پناہ اُنس اور لگاؤ۔ پاکستان، خدا اسے سلامت رکھے۔۔۔۔ لوگوں کو ایسا دُور کر دیا کہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے ترس گئے۔ بقول فراقؔ[۶]

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی — یاروں نے اتنی دُور بسائی ہیں بستیاں

میرے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ میری مٹی علی گڑھ کی تھی اور یہیں ٹھکانے لگی۔ اب اس خاک سے وابستہ ہو گیا ہوں اور اس ''جزیرے کی زندگی''[۷] سے اپنا دل لگا لیا ہے۔ آج کل شعبۂ اُردو میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔

میری نظموں کا مجموعہ ''کاغذی پیرہن''[۸] اس وقت پریس میں ہے۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں شائع ہو جائے گا۔ تمہیں ایک کاپی ضرور بھیجوں گا۔ فی الحال میری تصویر سے دل بہلاؤ اور ہو سکے تو اپنا ایک نیا فوٹو بھیج دو۔

ہمیشہ تمہارا
خلیل الرحمٰن اعظمی

[۳]

گرامی نامہ خلیل الرحمٰن اعظمی، بنام: قاضی نذیر احمد

آنند بھون،
سول لائنس، علی گڑھ — ۳۰-اکتوبر ۱۹۵۸ء

پیارے نذیر!

میں گرمیوں کی چھٹیوں میں مع اپنی بیوی[۹] کے کشمیر چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو ڈاک کے ڈھیر میں تمہاری شادی کا دعوت نامہ بھی رکھا ہوا ملا[۱۰] لیکن اس وقت تم اپنی شادی کرا کے اپنی بیوی کے ساتھ کسی خوش گوار مقام پر 'ہنی مون' منا رہے ہوگے۔ میں نے سوچا ایسے میں مبارک باد دے کر تمہیں کیوں بور کروں۔ پھر کئی بار خط لکھنے کا خیال آیا.....لیکن مصروفیات کے سبب بات ٹلتی رہی۔

اَب تم نے اس خط میں جس محبت وخلوص سے یاد کیا ہے، اس پر بے حد شرمندہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ تم جس قدر مجھے چاہتے ہو، اُتنی ہی میری طرف سے غفلت ہو جاتی ہے حالانکہ اس میں میری بدنیتی کو دخل نہیں.....تمہاری معصوم محبت کی بہت قدر کرتا ہوں۔ تم جو تلاش کر کر کے میری.....اور اسے سراہتے ہو، اُس سے دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ جلد اپنا ایک.....والا ملا ہے۔ ''فکر وفن''[۱۱] میں تمہیں نہ بھیج سکا جس کا افسوس ہے۔ پبلشر نے.....دس کاپیاں دی تھیں جو یہیں کے ساتھیوں کی نذر ہو گئیں۔ ادھر انجمن ترقی اُردو نے میری کتاب ''نوائے ظفر''[۱۲] شائع کی ہے۔ اسے بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

تم کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ علی گڑھ یونیورسٹی نے میری کتاب ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' پر مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری[۱۳] دی ہے۔ ایک اور کتاب ''مقدمہ کلامِ آتش''[۱۴] یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ یہ چیزیں چھپ جائیں تو تمہاری نذر کروں گا۔

سرگودھا کا ماحول کیسا ہے؟ تم نے.....کیے یا نہیں؟ ازدواجی زندگی کیسی ہے؟.....کہو.....

تمہاری بھابی تمہیں[۱۵] آداب.....

تمہارا اپنا
خلیل الرحمٰن اعظمی

[۴]

گرامی نامہ خلیل الرحمٰن اعظمی، بنام: قاضی نذیر احمد

آنند بھون،
سول لائنس، علی گڑھ ۳-اگست ۱۹۶۷ء

محبِّ عزیز!

تمہارے خطوط تعطیلات کے زمانے میں یہاں آئے۔ میں ادھر برابر سفر میں رہا، اس لیے بروقت جواب نہ دے سکا۔ تمہارے خلوص نے تو واقعی مجھے بہت شرمندہ کیا۔ میں اپنی بے پروائی کی وجہ سے تمہارے خطوں کا پابندی سے جواب نہیں دیتا لیکن تم نے اپنی محبت میں کمی نہیں کی۔ تمہارے کردار کا یہ رُخ بڑا دلکش ہے۔ بہر حال جہاں رہو خوش رہو۔

دوست، میں تم کو بھولا نہیں ہوں۔ ابھی تک علی گڑھ کی وہ صحبتیں آنکھوں میں پھر رہی ہیں۔ دُنیا بہت بدل چکی ہے لیکن تمہارا معصوم چہرہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ تمہارے مشاغل آج کل کیا ہیں؟ یہ خط

تمہارے گھر کے پتے (محلّہ: ڈھگّی پار، چنیوٹ، ضلع جھنگ، پاکستان) پر ہی لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے کہ مل جائے۔ جواب جلد دینا۔

تمہارا اپنا
خلیل الرحمٰن اعظمی

حواشی اور حوالے:

۱۔ (i) ڈاکٹر اسلام عشرت (شعبۂ اُردو، بی ایس کالج، دانا پور، پٹنہ) نے ''خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ترقی پسند سے جدیدیت تک'' موضوع پر ۱۹۸۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر اسلم آزاد کی رہنمائی میں تھیسس لکھ کر ڈگری حاصل کی۔ مقالے کی تلخیص ۱۹۸۸ء میں پٹنہ ہی سے کتابی صورت میں شائع ہوئی (ضخامت: ۳۲۳ صفحات)

(ii) امجد علی شاکر صاحب (پرنسپل گورنمنٹ کالج قصور) نے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی زیرِ نگرانی ۱۹۹۱ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد سے ''خلیل الرحمٰن اعظمی۔ احوال وآثار'' کے موضوع پر تحقیقی کام کر کے ایم فل (اُردو) کی سند حاصل کی۔ اس مقالے کے بیرونی ممتحن کے طور پر مجھے یہ مقالہ دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ بڑا مفید اور مستحسن کام ہے۔ افسوس کہ بار بار توجّہ دلانے کے باوجود فاضل مقالہ نگار اس تھیسس کتابی صورت میں اشاعت کو موخّر کیے جا رہے ہیں۔ (ضخامت: ۳۹۱ صفحات)

۲۔ ڈاکٹر معین احسن جذبی، مقیم علی گڑھ (تاریخ ولادت: ۲۱/اگست ۱۹۱۲ء)

۳۔ اعظمی صاحب کی یہ نظم رسالہ ادبِ لطیف لاہور کے غالباً شمارہ مارچ ۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء میں چھپی۔

۴۔ پروفیسر رشید احمد صدّیقی، ولادت: ۲۴/دسمبر ۱۸۹۲ء، وفات: ۱۷/جنوری ۱۹۷۷ء۔

۵۔ یہاں کچھ لفظ آب زدگی کے باعث پڑھے نہیں جا رہے۔ ان کی جگہ.....خالی چھوڑ دی گئی ہے۔

۶۔ فراق گورکھ پوری، ولادت: ۲۸/اگست ۱۸۹۶ء، وفات: ۳/مارچ ۱۹۸۲ء۔

۷۔ یہاں ایک آدھ لفظ پڑھا نہیں جا رہا۔

۸۔ کاغذی پیرہن، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۵ء۔

۹۔ ۱۹۵۷ء میں خلیل صاحب کی شادی راشدہ بیگم سے ہوئی۔ کامران، سلمان، عدنان بیٹے اور ہُما پیاری بیٹی ہیں۔

۱۰۔ قاضی نذیر احمد کہتے ہیں کہ اُن کی شادی ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ اس پر اعظمی صاحب نے سہرے کے کچھ شعر کہہ کر بھیجے تھے۔ ان میں سے ایک شعر قاضی صاحب کو آج بھی اس شکل میں یاد ہے:

نوید آئی ہے کس کی تقریبِ عروسی کی؟
کہ خود کلیاں چمن کی، آرزو میں بن گئیں سہرا

۱۱۔ فکر وفن، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۶ء۔
۱۲۔ نوائے ظفر، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء۔
۱۳۔ ڈگری سال ۱۹۵۷ء میں ملی۔ طبع اول انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۷۲ء، طبع سوم: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء، طبع جدید: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء۔
۱۴۔ مقدمہ کلام آتش، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۹ء۔
۱۵۔ بیگم راشدہ خلیل ایک خوش فکر اور سلیقہ شعار صاحبِ قلم ہیں۔ وہ ''بزم ادب'' کے نام سے علی گڑھ کی بزمِ خواتین کا ایک سالانہ جریدہ شائع کرتی ہیں۔ سال ۲۰۰۴ء میں اس کا نواں (شمارہ نمبر ۹) اپنے ''گوشہ فرحت'' کے باعث بالخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ سیدہ فرحت (وفات: ۱۱ر فروری ۲۰۰۳ء) ایک بے غرض اور بے نفس سوشل ورکر اور ''بزم ادب'' کی بانی معانی تھیں۔ ''بزم ادب'' کا تازہ شمارہ (سال ۲۰۰۴ء) ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے ورق ورق پر بیگم راشدہ خلیل کے پاکیزہ ذوقِ ادب کے نقوش کندہ ہیں۔ اعظمی میموریل سوسائٹی کی سیکریٹری کے طور پر وہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نگارشات کی ترتیب و اشاعت کا فریضۂ رفاقت ادا کرنے میں بھی پیش پیش ہیں۔ اس میموریل سوسائٹی کی جانب سے اعظمی صاحب کے تین شعری مجموعوں کا انتخاب بہ عنوان ''آسماں اے آسماں'' کتابی صورت میں چھپا ہے۔ (سال اشاعت ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۴)
یہ شعری انتخاب پروفیسر شہریار نے کیا ہے۔ کتاب کے بارے میں ''بعض وضاحتیں'' اعظمی میموریل سوسائٹی کی سیکریٹری کی حیثیت سے بیگم راشدہ خلیل کے قلم سے ہیں۔ یہاں میں اپنی بات کو شمس الرحمٰن فاروقی کی بات پر ختم کرتا ہوں۔ ورڈزورتھ نے ملٹن سے خطاب کرتے ہوئے ایک سانیٹ میں لکھا تھا کہ ملٹن تجھے اس گھڑی زندہ اور ہمارے درمیان موجود ہونا چاہیے تھا۔ انگلستان کو تیری ضرورت ہے۔ ورڈزورتھ نے اپنے زمانے کے انگلستان کو ٹھہرے اور سڑتے ہوئے پانی کا جوہڑ کہا تھا ____ لیکن پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول:

> ''ہمارے ادب میں جس قسم کی دوڑ بھاگ، ذاتی مفاد اور چند لمحوں کی کامیابی کے لیے جوڑ توڑ، نااہلی کی قدر افزائی اور اہلیت کی کم ارزی کا طوفان برپا ہے، اُس میں ٹھہراؤ اور ہمارے مزاجوں میں اعتدال لانے کے لیے خلیل الرحمٰن اعظمی کا ادب اور خود اُن کی شخصیت ہمارے لیے مشعلِ راہ کا کام کر سکتے ہیں۔ خلیل صاحب، آپ کو آج زندہ اور ہمارے درمیان موجود ہونا چاہیے تھا۔''

☆☆☆

تنویر صاغر

کارل گستاؤ ژونگ اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں

کارل گستاؤ ژونگ کا شمار عہدِ حاضر کے ماہر، نفسیات دانوں میں ہوتا ہے۔ ابتدائی دنوں میں اُنہیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو آج حاصل ہے، جس کا بیّن ثبوت مغرب اور مشرق کے ژونگ شناسوں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔

ژونگ ایک نظریہ ساز نفسیات دان تھے، وہ کسی نظریے سے اس وجہ سے متاثر نہ ہوتے کہ نظریہ ساز ایک مقبول شخص ہے بلکہ وہ نظریے کی اساس اور اُس کے عصری تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس کا تجزیہ کرتے تھے۔ ژونگ کا کام تیس ضخیم مرتب جلدوں میں ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سو کے قریب Articles مختلف اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوئے، اُن کے لیکچرز اور صدارتی خطبات کی تعداد بھی بیش بہا ہے۔

اُردو ادب میں ژونگ کے نظریات کا خیر مقدم، ڈاکٹر محمد اجمل اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے کیا، ثانی الذکر نے ژونگ کے نظریات اور مختلف نفسیات دانوں کی نظر میں ژونگ کے مقام کا سب سے اہم مطالعہ کیا۔ سہیل احمد خاں کی تصنیف بعنوان ''ژونگ کے نفسیاتی نظریات'' ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آئی جس میں چھ ابواب کے احصاء سے ژونگ کے نظریات کی جزوی تکمیل کی گئی ہے۔

''ژونگ کے نظریات کی فکری معنویت'' میں ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے ژونگ کے نظریات کی اہمیت کو ژنگی نقادوں جولینڈ جیکوبی، ایرا پروگوف، امریکی مفکر لیوس ممفورڈ اور انگریزی شاعرہ کیتھلیس رین کے نقطۂ نظر کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ژونگ کے نظریات، اجتماعی لاشعور، تلازمی آزمائش، نخست مثالی (Archetype)، Animus، Anima کو زیرِ بحث لائے ہیں اور انہوں نے ادبی تنقید میں اساطیری تنقید کے باقاعدہ مکتبۂ فکر کا آغاز ژونگ سے کیا ہے جو ژونگ کے بنیادی نفسیاتی نظریات کے زیرِ اثر قائم ہوا۔

زندگی کی مختلف نفسیاتی کشمکشوں سے نجات کے لیے شعور اک ذریعہ ہے۔ شعور کیا ہے؟ کسی شے کی موجودگی اور اُس شے کے ادراک میں ارتباط ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں، شعور کے مراحل کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''شعور کا پہلا مرحلہ صرف پہچاننا ہے جو انتشار کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر اَنا حکمران ہوتی ہے اور ایک طرح کی وحدت آجاتی ہے مگر تیسرے مرحلے پر شعور ایک درجہ بڑھتا ہے اور ثنویت یا بٹے ہونے کا احساس

جا گتا ہے۔'' (ص ۴۵)

ژونگ نے زندگی کے مراحل جن میں بچپن، جوانی، بڑھاپا شامل ہیں، کو زندگی کی نفسیات کا پیش خیمہ قرار دیا ہے جو اجتماعی لاشعور کا حصہ بھی ہیں اور شعوری محرک بھی۔ ژونگ کے نزدیک زندگی کا اہم اور مشکل مرحلہ بلوغت ہے، چالیس، پینتالیس سال کی عمر کا مرحلہ تبدیلیوں کا حامل ہے جو زندگی کی نفسیاتی حقیقتوں کو اِک نئے تناظر سے دیکھنے کی صلاحیت بخشتا ہے اور رویے کی تبدیلیاں بھی اسی مرحلے کا خاصہ ہیں۔ اس سلسلے میں ژونگ کے خیالات بزبان ڈاکٹر سہیل احمد خاں کچھ یوں ہیں:

''ہماری عمر کا ایک سواسی درجے کا خط منحنی چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا چوتھائی حصہ بچپن کا ہے جس میں ہم دوسروں کا مسئلہ ہوتے ہیں اور خود اپنے مسائل کا شعور نہیں رکھتے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں شعوری مسائل سامنے آتے ہیں اور عمر کے آخری حصے یعنی بڑھاپے میں ہم پھر لاشعور کی گرفت میں چلے جاتے ہیں۔ بچپن اور بڑھاپے میں بہت فرق ہے لیکن یہ چیز دونوں میں مشترک ہے اور اسی حوالے سے ہم بڑھاپے میں بچپن کی طرح پھر دوسروں کے لیے ایک طرح کا مسئلہ بن جاتے ہیں۔'' (ص ۴۲)

کیمیا گری خالصتاً نفسیاتی موضوع نہیں ہے بلکہ سائنسی اور تحقیقی موضوع ہے ہاں البتہ اسے نفسیات کی حدود سے باہر قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ژونگ نے کیمیا گری کی نفسیاتی سطحیں تلاش کیں۔ ژونگ کی نفسیات کا کمال یہ ہے کہ اُس نے غیر نفسیاتی اور سائنسی موضوع کو بھی نفسیاتی بنا دیا اور اُس کی نفسیاتی سمتیں تراشنے کی سعی کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ژونگ کی نفسیات اور کیمیا گری کی مماثلت کے ماخذ، ڈاکٹر سہیل احمد خاں یوں بیان کرتے ہیں:

''ژونگ نے اس موضوع پر اپنی ابتدائی تحریروں میں ان خوابوں کا تذکرہ کیا جن میں فردیت کے حصول کے مراحل اور کیمیا گری میں اسے مماثلت نظر آئی، اسی بنیاد پر اس نے کیمیا گری کی بعض علامات کی نفسیاتی تشریح کی۔ اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دھاتوں کی قلب ماہیت کے متوازی دراصل نفسیاتی قلب ماہیت ہوتی تھی۔ ژونگ نے جب یہ تحقیق شروع کی اس وقت نفسیات اور کیمیا گری کے تعلق پر صرف ہربرٹ سلبرر کی ایک تصنیف موجود تھی۔ ژونگ اس تذبذب میں بھی تھا کہ اسے اس میدان میں قدم رکھنا بھی چاہیے یا نہیں؟ کہیں یہ ''نفسیاتی حقائق'' کے دائرے سے بھٹک جانے کے مترادف تو نہ ہوگا؟ مگر ژونگ کو جو مماثلت نظر آئی وہ اتنی گہری تھی کہ وہ اپنی تحقیق جاری رکھنے پر مجبور تھا۔'' (ص ۴۷)

ژونگ نے اُڑن طشتریوں کے بارے میں رائج العام غلط معلومات اور کہانیوں کو بے بنیاد

قرار دیا ہے، انہوں نے اُڑن طشتریوں کے تصور کو اپنے نفسیاتی مریضوں کے معالجے میں بھی استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے یہ بیان کیا ہے کہ ژونگ کی اُڑن طشتریوں کے موضوع پر ایک تصنیف بھی ہے مگر ژونگ نے اس تصنیف میں اُڑن طشتریوں کی باقاعدہ تعریف نہیں کی بلکہ اس کے وجود کو ایک تجرباتی مشاہدہ قرار دیا اور اس کی نفسیاتی توجیہہ بیان کی۔ مزید ژونگ اور دوسرے ماہرین نفسیات کا اس میں دلچسپی کا سبب خوابوں میں اس کی آمد قرار دیا ہے۔ ہمعصریت سے مراد بامعنی اتفاقات ہیں جو غور طلب ہوتے ہیں مگر بیشتر لوگ اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں ژونگ کی ہمعصریت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''ژونگ کے خیال میں بامعنی اتفاقات (جو عالم اتفاقات سے علیحدہ ہیں) نخست مثالی بنیاد سے مربوط محسوس ہوتے ہیں۔ ''ہمعصریت'' صرف دو واقعات کا ایک ساتھ رونما ہونا نہیں بلکہ اُن دو واقعات کا بیک وقت رونما ہونا ہے جن میں گہرا ربط ہو۔ یہ ''ہمعصریت'' کسی نفسی کیفیت اور ایک یا زیادہ خارجی واقعات کا بیک وقت رونما ہونا ہے جو اس لمحاتی داخلی کیفیت کے متوازی ہوں۔'' (ص ۶۲)

کتاب کے آخر میں سب سے اہم کام، ژونگ کے بارے میں انگریزی اور اُردو میں مواد کا تذکرہ ہے جو ژونگ کے قارئین کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔

☆☆☆

رانی آکاش ہاشمی

''ڈاکیا اور جولاہا''

مستنصر حسین تارڑ کا شمار اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جو بہت زیادہ لکھنے والے ہیں۔ زیادہ لکھنے والے ادیب کے لیے قابلِ گرفت بات یہ ٹھہرتی ہے کہ کیا اُس کے ہاں اُسلوب اور موضوع کی تکرار تو نہیں کیونکہ تکرار ہی ایسی چیز ہے جو قاری میں اکتاہٹ پیدا کرتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہی تکرار تارڑ کے ہاں موجود ہے لیکن تکرار بن کر نہیں ایک کڑی بن کر۔

میرا تارڑ سے پہلا تعارف ''بہاؤ'' کے ذریعے ہوا۔ ''بہاؤ'' میں مَیں نے مور اور پانی کے حوالے سے ناول کو آگے بڑھتا دیکھا۔ یہ مور جب دُکھوں سے میاؤں میاؤں کرتا ہے تو پاروشنی بہتے پانیوں پر اس کی آواز کا عکس دیکھتی ہے۔ اسی مور کو میں نے ''راکھ'' میں پس منظر کی موسیقی کے طور پر محسوس کیا، ''قربت مرگ میں محبت'' میں یہی مور جا بجا رقصاں ہے۔

صرف ''قلعہ جنگی'' تارڑ کا ایسا ناول ہے جو اپنی کڑیوں میں افغانستان کو شامل کرتا ہے تو صرف واقعات کا بیان اُس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں ناول ''ڈاکیا اور جولاہا'' منظرِ عام پر آیا۔ اُسلوب، بُنت اور فکری مواد کے حوالے سے اس میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو تارڑ کے پہلے ناولوں میں ہیں۔ تاہم اپنی تھیم کے حوالے سے یہ اس لیے منفرد ٹھہرتا ہے کہ اس میں ڈاکیے اور جولاہے کو باقاعدہ نظریۂ جبر کا نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ محمد علی ڈاکیا اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار ''کے ٹو کہانی'' میں بھی اُن کے سامنے تھا۔ یہی کردار ''ڈاکیا اور جولاہا'' کی بنیادی تھیم بنا۔

ڈاکیا محمد علی نصیب کی چٹھی لوگوں کے لیے لاتا ہے۔ لوگ اس چٹھی سے بچنے کی چاہے لاکھ کوشش کریں لیکن یہ خود ہی ہوا کے دوش پر اُڑ کر اُن کے سامنے آجاتی ہے۔ لفافے میں سے سفید ورق پھڑ پھڑاتا ہوا نکلتا ہے اور انسان جو کہ مجبورِ محض ہے اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوتا ہے۔

> ''یہ غیب سے کس کے علم میں آ گیا تھا کہ میں فلاں وادی میں سے ایک معین زمانے میں گزروں گا۔۔۔۔ یہ پتا کس کو تھا۔۔۔ اور کس نے لکھا۔'' (ص ۷)
>
> ''اس کا تذکرہ کیا کرنا کہ میں نے اب تک ہمیشہ سلجھے ہوئے دھاگوں سے ہی کھیس بُنے ہیں اُن کے ڈیزائن اور رنگوں کے انتخاب کا دھیان ایسا رکھا ہے کہ سب نے انہیں اپنی روح کے نہاں خانوں میں سجایا ہے اور میری بُنت اور کاریگری کی داد دی ہے۔ اس بار بھی میرا ارادہ تو یہی تھا لیکن سامنے سے اپنے بدخشانی گھوڑے کی تھرکتی پیٹھ تھپکتا محمد علی ڈاکیا آ گیا اُس نے اُن سارے

> دھاگوں کو جو میں آج تک ترتیب و تناسب کی کھڈی پر بُنتا آیا تھا اُلجھا کر رکھ دیا۔۔۔ تو اس میں میرا تو کوئی دوش نہیں۔'' (ص ۱۱)

اس ناول کی ہر ہر سطر میں تخلیق کار نے اس super طاقت کے سامنے برضا و خوشی گھٹنے ٹیکے ہیں اور اپنی ناقص عقل اور کم طاقتی کو تسلیم کیا ہے۔

> ''تو میں وہ جولاہا ہو گیا ہوں جس کی ڈور کوئی اور کھینچتا ہے۔۔۔۔ اُلجھے ہوئے حیات کے دھاگوں کو اپنی کھڈی پر چڑھاتا ہوں۔'' (ص ۱۲)
>
> ''اس لیے کہ آپ نصیب کی قید میں ہیں۔۔۔ اور نصیب کی تختی پر کچھ پُورتے ہیں۔۔۔ ایک خطاطوں کے خطاط نے اس تختی پر اپنی اٹل کالک سے مدھم سیاہی میں کچھ حرف اُلیک دیئے ہیں اور آپ نے صرف ان مدہم لفظوں پر قلم چلا کر انہیں واضح اور اُجاگر کرنا ہے۔۔۔ آپ نے وہی لکھنا ہے جو لکھا جا چکا ہے۔۔۔ تو آپ نے ناحق خود مختاری کی تہمت اپنے سر لے لی۔۔۔ بدنام ہو جائیں گے۔ اس لیے آپ نے اسی عبارت پر قلم چلانا ہے جو لکھی جا چکی ہے۔ آپ کے بس میں کچھ بھی نہیں۔'' (ص ۱۸)

تارڑ نے تقدیر کے سامنے انسانی ارادوں کے بڑے بڑے پہاڑوں کو بے بس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قسمت کی منہ زور ندی کے راستے میں ہر چیز خس و خاشاک بن کر بہہ جاتی ہے۔ سائنس کے نزدیک انسان یا ہے یا نہیں اس کا ایک structure ہے جسے ایک خاص وقت کے بعد لازمی زوال آنا ہے۔ وہ یا عروج ہے یا زوال ہے۔ یہ ڈھانچہ ایک خاص وقت کے بعد اُس عمارت کی طرح سے ٹوٹ جاتا ہے جس کی معیاد پوری ہو چکی ہوتی ہے۔ تارڑ نے موجودہ مشینی زندگی کے ہنگامے میں اسی نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ایک متعین خاص وقت سے پہلے اور بعد کے عرصے کے دوران میں بھی کچھ نہ کچھ کہیں بھی ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ تارڑ وقت کے متعین مقام سے یکسر انکاری ہیں۔ اُن کے نزدیک وقت وہی ہے جو اُس super طاقت کے تابع ہے۔ وہ طاقت وقت کو اُس کے مقام اور حدوں سے دُور لے جانے پر قادر ہے۔

تخلیق کار ہمیشہ مضطرب و متحرک اور ہر دم بے چین رہتا ہے۔ اسی بے چینی، عدم اطمینانی اور اندرونی فشار کا بیان ہمیں اس ناول میں بھی ملتا ہے۔ رودین، نتالیہ، سوان اور دیگر چھوٹے کردار اسی انتشار کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ نتالیہ جو کہ سیدزادی ہے بہت سی پابندیوں میں گھری ہے۔ اپنے اندر کے جوار بھاٹے کو خطوط کی شکل میں لکھنے پر مجبور ہے۔ وہ تمام قدروں سے انکاری ہے۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے گھر، بچے، مذہب سب کچھ تیاگ دیتی ہے لیکن وہ سکون جس کی اُسے تلاش ہے کہیں نہیں ملتا۔ سب کچھ ترک کرتی ہے تو سمجھتی ہے کہ سوان اُس کا بھائی اُسے سراہے گا لیکن وہ سوان جو مذہب،

روایت اور کلچر ہر چیز کا مذاق اُڑاتا ہے گدی نشین بن کر ''پیر مٹھا'' کہلاتا ہے۔ سینکڑوں لوگ تعویز کے لیے اُس کے گرد جمع ہیں۔ نتالیہ اُس کی آنکھوں میں اپنے لیے شناسائی کی ایک چمک تک نہ پا کر ہراساں ہے۔ نتالیہ ناول کا مرکزی اور اہم کردار ہے جس کی تکمیل تارڑ نے سوان کی شکل میں دکھائی ہے۔

سوان اس ناول کا سب سے پُرکشش اور زندگی سے بھرپور کردار ہے۔ وہ آغاز میں ایک مارکسسٹ کے روپ میں سامنے آتا ہے اُس کے نزدیک مادی زندگی کا تشکیل کردہ نظام پیداوار ہی ہے جو انسان کی مختلف سیاسی، سماجی، تاریخی اور فکری کیفیات کو بیان کرنے پر قادر ہے۔ اُس کے نزدیک مارکسی نظریہ ہی سب کچھ ہے کیونکہ یہی وہ نظریہ ہے جو محنت پیشہ طبقے کو جدوجہد پر اُکساتا ہے۔ اس لیے جن لوگوں نے اس نظریے کو فروغ دیا اور اس نظام کے بارے میں لکھا وہی اصل ادیب ہیں۔

سوان، نتالیہ کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے۔ دونوں مارکسی فلسفے، مارکسی نظریات اور مارکسی ادبا کے معتقد بن کر انہی کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ناول میں جگہ جگہ لینن، ٹالسٹائی، اینگلز اور مارکس کی بولیاں اُن کی آوازوں میں شامل ہیں لیکن ناول کے آخر میں سوان تمام فلسفوں کو پسِ پُشت دھکیل دیتا ہے اور مذہب میں پناہ لے لیتا ہے۔

> ''یہ وہ سوان تو نہ تھا۔۔۔ تیز چمکیلی آنکھوں والا انقلابی جو معاشرے کی بوسیدہ اقدار کو رَد کر کے ایک مثالی نظام کے خواب دیکھتا تھا جو خانقاہی نظام کو افیون قرار دے کر اُسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا۔۔۔ اُسے یقین تھا کہ پچیس برس بعد جب وہ گاؤں میں داخل ہوگی تو وہ اپنے انقلابی نظریات پر قائم و دائم شاید ایک ٹریکٹر پر سوار اپنی زمینوں میں جدید زراعت کے اُصولوں پر عمل کرتے ہوئے نت نئی فصلیں اُگا رہا ہوگا۔ باغ لگاتا ہوگا اور اُسے دیکھ کر وہ ٹریکٹر سے چھلانگ لگا کر اُترے گا اور اُسے گلے لگا کر کہے گا۔۔۔ ہیلو کامریڈ اتنا عرصہ کہاں رہے؟ اُسے یقین تھا کہ سوان ایسا ہی ہوگا۔ سوان کے پیر مٹھا ہو جانے ۔۔۔ پر اُسے دھچکا لگا تھا۔۔۔ وہ ابھی تک اس کی شدت کو برداشت کرنے کے قابل نہ ہو رہی تھی۔''

سوان کے اس بدلے ہوئے روپ کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ یہ ناول دراصل آرٹ، سائنس اور مذہب کی کشمکش کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ تارڑ نے سائنس کو قطعی اور حتمی طور پر مذہب کے تابع قرار دیا ہے۔ سوان اور نتالیہ دونوں چیزوں کے حُسن اور ادب میں تاریخ کی اعلیٰ قدروں کے قائل ہیں جنہوں نے اپنے نام سے یہ حُسن مظاہر کو بخشا۔ وہ اپنے گھر اپنے مذہب اور اپنی اُن روایات کو قابلِ تحسین نہیں سمجھتے جن کی جڑیں مقامی لوگوں میں پیوست ہیں۔ آغاز میں وہ بڑے بڑے آدرش رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں اور اُنہی کے نظریات کو آگے لے کر چلتے ہیں۔ تاہم اُن کے یہ نظریات اُس وقت زمین بوس

ہو جاتے ہیں جب سوان کا بدلا ہوا روپ ناول کے آخر میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک انقلابی اپنی جڑوں سے اس قدر وابستہ ہو جاتا ہے کہ ''پیر مٹھا'' کہلاتا ہے۔ تارڑ نے مذہب کو انسانی زندگی کے لیے source of peace قرار دیا ہے جس کے نہ ہونے سے فرد کی کوئی شخصی زندگی نہیں رہتی۔ وہ خلا میں بھٹکتا رہتا ہے۔

اس ناول میں ''مردہ شاعرہ'' کا تذکرہ آیا ہے جو میرے اندازے کے مطابق پروین شاکر کا ہے اس سے پہلے بھی اُن کے ناولوں میں اُن کے ہم عصروں کا ذکر ملتا ہے۔ ''قربت مرگ میں محبت'' میں انہوں نے اپنی ساتھی فنکاروں کا ذکر اور پھر اُن کی اچانک موت کو بیان کیا ہے۔ ''راکھ'' میں بھی ان کے عہد کی بہت سی شخصیات کا حوالہ نام کے ساتھ موجود ہے۔ یوں کہیں کہیں اُن کے ناول سوانحی بھی ہو جاتے ہیں۔

تارڑ کے ناولوں میں دو نظریات ہمیشہ سے حاوی رہے ہیں۔ اوّل عشق دوئم موت۔ عشق اُن کے نزدیک زندگی کا حُسن اور کائنات کے تحرک کا باعث ہے۔ یہی عشق ہے جس نے انسان کو دوسرے سے متعارف کروایا ہے اور اسی کے ذریعے باقی ماندہ ضروریات انسانی کی اہمیت کو وہ تسلیم کرتے ہیں۔ اسی عشق کو ''بہاؤ'' میں پاروشنی، ''راکھ'' میں برگیتا مشاہد، ''قربت مرگ میں محبت'' میں ایک سے زیادہ کردار اور ''ڈاکیا اور جولاہا'' میں رودین، نتالیہ اور چھوٹے موٹے ثانوی کردار آگے لے کر بڑھتے ہیں۔

رومانٹک مکالمات اور واقعاتی سچائی کو بیان کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں تحریر سستی قسم کی جذباتیت کا نمونہ بن کر نہ رہ جائے۔ تارڑ کے ہاں ایسے مقامات پر قلم یوں رواں ہوتا ہے کہ لفظ گویا چل کر خود نوک کے نیچے آموجود ہوتے ہیں۔

> ''اب عشق نڈھی کے تھاؤں تھائیں بول رہا تھا۔ بدن کا ہر موجب بولتا ہے تو ڈھنڈیا پٹ جاتی ہے۔ کُل جہان کو خبر ہو جاتی ہے۔ چہار سُو لاؤڈ اسپیکر لگ جاتے ہیں عشق کے اعلان ہونے لگتے ہیں۔ زمین پر جتنی بھی مخلوق سانس لیتی ہے اُسے تو خبر ہو ہی جاتی ہے لیکن زمین کے اندر کے مکین بھی جان جاتے ہیں کہ اوپر ایک نڈھی کے تھاؤں تھائیں عشق بول رہا ہے کہ اس عشق کی ایک دھمک ہوتی ہے جو زیرِ زمین بھی سنائی دیتی ہے۔ عشق کا ہاتھی۔۔۔ پوش کریندا پوش ۔۔۔ ہر شے کو روندتا چلا جاتا ہے۔'' (ص ۲۹)

اُن کے کردار جب عشق کے رشتے میں بندھتے ہیں تو ایسے مقامات پر تارڑ استحقاقی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور عشق کو انسان کا بنیادی حق قرار دیتے ہیں۔

> ''اُس اَن چھوئے گورے پنڈے اور لامبی تھرتھراتی برف کی بنی ہوئی کونپلوں ایسی انگلیوں کے ساتھ وہ ایک نادیدہ عشق کے ہاتھی تلے گھر کی چار دیواری سے نکلے بغیر اس بڑے صحن میں بیٹھے جس کی کچی دیواروں کے چوبی دروازے اتنے بلند تھے کہ ان میں سے اونٹ بھی گزر سکتے تھے۔۔۔ وہیں بیٹھے بٹھائے وہ اس

ہاتھی تلے روندی گئی۔'' (ص ۱۱۴)

اُن کے ہاں عشق جامد نہیں بلکہ کردار اُس کی چکی میں پس کر اور گھوم کر اپنا گوہر مقصود لمبے فاصلوں کی دُوری کے باوجود حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عشق کے اظہار کے ضمن میں اُن کے نسوانی کرداروں کی خوبصورتی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مرد کرداروں کی نسبت اُن کے نسوانی کرداروں میں زیادہ زندگی اور جان ہے۔ پاروشنی، برگیتا، نتالیہ، غلافی آنکھیں، سب اپنے اندر اٹریکشن رکھتی ہیں اور جذباتی طور پر قاری کی توجہ کو زیادہ شدت سے اپنی جانب کھینچتی ہیں کیونکہ آخری وقت تک اُن کے ہاں ایک مزاحمت اور جدوجہد کا احساس باقی رہتا ہے اور وہ قاری کو بھی جذباتی طور پر مشتعل کر کے اپنے ساتھ اس مہم میں شریک کر لیتی ہیں۔

موت جیسی ابدی حقیقت کا ذکر تارڑ کے ناولوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ ہر مرکزی کردار کو ناول کے آخر میں موت سے ہمکنار کروانا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ اسی منظر کی تشکیل کے لیے انہوں نے ناول کا تانا بانا مرتب کیا ہے۔ وہ تمام ناول جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اُن کے کردار ایک ایک کر کے ختم ہوتے جاتے ہیں۔ کسی بھی کردار کی موت کے بیان پر تارڑ کا قلم تیزی سے چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ جسم و جاں کے رشتے کے ختم ہونے کو وہ طویل صفحات پر پھیلا دیتے ہیں لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ جب وہ کردار کو زندگی سے موت کی طرف لے کر جاتے ہیں تو قاری دم سادھ لیتا ہے۔ اس موقع پر مکالمے کم اور منظر کا بیان زیادہ ہوتا ہے جس کے سحر سے قاری تب تک نہیں نکلتا جب تک کہ کردار کی موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہ طوالت اُس ناول میں بھی موجود ہے لیکن اس کی وجہ تارڑ کی سفرنامہ نگاری ہے سفرنامہ نگار ہر چیز کو باریک بینی سے دیکھتا اور بیان کرتا ہے۔

اس ناول میں مقامی رنگ نمایاں ہے۔ اپنے دیس اپنی مٹی اور اپنے وطن کی بُو باس ہے جس کی طرف مرکزی کردار لوٹ کر آتے ہیں۔ ناول کا وہ حصہ کمزور ہے جو نتالیہ کے خطوط پر مبنی ہے تاہم اپنی تھیم اور بُنت کے حوالے سے اس ناول میں کئی نئی چیزیں ملتی ہیں جن کا بیان ناول نگار نے بڑی جرأت سے کیا ہے مثلاً گے بچوں کی پیدائش، اُن کے مسائل، مغربی ممالک میں مسلم ثقافت رکھنے والوں کی منافقت بھری زندگی اور اس زندگی کی ناہمواریوں کا بیان تارڑ نے ''ڈاکیے'' اور ''جولاہے'' دونوں کو نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ جولاہا نمائندہ ہے انسانوں کا جو اپنی خواہش و تدبیر سے زندگی کو نت نئے دھاگوں کے ڈیزائنوں سے رنگین کرتے ہیں مگر ڈاکیا جب نصیب کی چٹھی لاتا ہے تو اُس کی کھڈی کا تانا بانا اکھڑ جاتا ہے اُسے ہر حال میں اُس خط کو وصول کرنا ہوتا ہے جس میں زندگی کی معیاد ہوتی ہے۔

> ''اُس نے کہاں چاہا تھا۔۔۔ خواہش نہیں کی تھی کہ کون حنوط ہو جانا پسند کرتا ہے۔ بس اسی مجبوری اور بے بسی کے تحت جو پوسٹ ماسٹر کے رجسٹر میں ازل سے درج ہوتی ہے۔ اُسی کے اختیار میں ہوتی ہے وہ اسی کورے کاغذ اور

بدخشانی گھوڑے کے برابر میں پتھر ہو گیا۔'' (ص ۳۰۴)

Diction کے حوالے سے اس ناول میں ہمیں تین نمونے ملتے ہیں ایک نمونہ تو وہ ہے جو ہمیں مقامی اشیا کے بیان میں ملتا ہے۔ مثلاً

> ''سوہنی کی مانند ہمارے گھڑے کچے نہ تھے۔'' (ص ۱۶)
>
> ''وہ ایک خاص نخرے سے چلتا آتا تھا جیسے اُس کے پاؤں میں جھانجھریں ہوں۔'' (ص ۱۷)
>
> ''گاؤں کی منجمد رات کے اترتے ہی نائی، دھوبی، ترکھان، لوہار، ماچھی، جولاہے۔۔۔ بے دم اور بے حال دن بھر کی مشقت کی بدن توڑ تھکاوٹ میں چُور اپنے دیئے کی لَو نیچی کر دیتے تھے کہ ان کے پاس رات میں دیکھنے کو کچھ نہ ہوتا تھا۔'' (ص ۴۷)

اُسلوب کا دوسرا نمونہ قدرے سادہ ہے اور یہ وہ حصہ ہے جہاں نتالیہ نے خطوط کی زبان میں اپنی گھریلو زندگی کو اور اپنے آپ کو کھول کر بیان کیا ہے۔ اس حصے میں ناول نگار بڑی سادگی سے روزمرہ زندگی کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اُسلوب کا تیسرا نمونہ وہ ہے جہاں زمانی حالت بدلتی ہے اور یہ ناول کا وہ حصہ ہے جب نتالیہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ملک سے باہر زندگی گزار رہی ہے۔ اس حصہ میں جگہ کی تبدیلی کے ساتھ ہی زبان بھی پلٹا کھاتی ہے۔

> ''گے بارز، گے ریستوران اور گے جمگھٹے۔'' (ص ۲۱۰)
>
> ''بخاری صحیح معنوں میں ایک رولنگ سٹون تھا جو اپنے وجود پر کائی جمع نہیں ہونے دیتا تھا۔'' (ص ۲۱۰)

ناول کا اختتام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ باقی ناولوں کی طرح ''ڈاکیا اور جولاہا'' کا اختتام بھی کرداروں کی موت پر ہوتا ہے لیکن اس ناول میں مرکزی کردار کی موت دراصل ناول نگار کے اُس نظریے کا پیغام ہے جس کا اشارہ ناول کے آغاز میں اُس نے جگہ جگہ کیا ہے۔ فنی طور پر اگرچہ اس ناول میں کچھ خامیاں ہیں لیکن اُسلوب کی سادگی اور موضوع کی دلکشی نے اسے ایک مقبول ناول بنا دیا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر انوار احمد

خون خاک نشیناں

پہلا منظر (ایک گھر، متوسط طبقے کا، تعلیم یافتہ لوگ)

امجد: ''کوئی بات کی اس نے؟ ہونٹ کھولے یا ویسے پتھر کی مورتی؟

سلمٰی: ''نہیں، بالکل نہیں، اس کے چپ رہنے سے پہلے اس کی آنکھوں سے ڈر لگتا تھا، اب چہرے سے ہی نہیں اس کے بستر اور کمرے میں بھی ایک طرح کی وحشت سما گئی ہے۔''

امجد: ''میرا خیال ہے کہ وہ بولے گی ضرور، منی کو بلوا لو وہ اسے دیکھ کے ضرور پگھلے گی۔''

سلمٰی: ''منی بھی مایوس واپس گئی ہے، مجھے تو اس سناٹے سے ڈر لگتا ہے۔''

(موبائل کی میوزیکل گھنٹی بجتی ہے)

امجد: ''ہیلو! ہیلو کون؟ بولتے کیوں نہیں؟ کمال ہے، یہ صبح سے اس نمبر سے تیسرا فون ہے، کوئی ہے جو تنگ کر رہا ہے، خاموش رہ کے۔''

سلمٰی: ''کوئی لڑکی ہوگی۔''

امجد: ''تمہاری تفتیش بعد میں شروع ہوتی ہے مگر نتیجہ پہلے نکل آتا ہے۔''

سلمٰی: ''اس نمبر کو تو ٹریس کیا جا سکتا ہے؟ آسانی سے۔''

امجد: ''بہت جعلسازی ہے، اس کاروبار میں، دفع کرو، تم بس کوشش کرو کہ ایک مرتبہ وہ بولے تو سہی۔''

سلمٰی: ''میں تو جاتی ہوں، اسے پیار کرتی ہوں، اسے دودھ، چائے، شربت، چمچے سے پلاتی ہوں، کھانا وہ کھا نہیں رہی، فون کی گھنٹی بھی بجتی ہے تو پہلے کی طرح لپکنے کی بجائے بے تعلقی سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔''

امجد: ''میں نے رؤف شیخ سے کہا ہے کہ وہ اسے تین، چار Sittings دے، وہ ایک کانفرس میں جا رہا ہے، اسلام آباد، وہاں سے آجائے تو سیدھا ہمارے ہاں آئے گا، مجھے اس سے بڑی اُمید ہے۔''

سلمٰی: ''میں نے اسے بہت سے رنگ، کیرآن اور کینوس لا دیئے ہیں، مگر مجال ہے، جو اس نے ایک لائن بھی کھینچی ہے، اس کی زبان اور آنکھوں کی طرح انگلیاں بھی خاموش ہیں۔''

امجد: مجھے تو وہ شاید پہچان بھی نہیں رہی، عجیب طرح سے بالکل اجنبیوں کی طرح دیکھتی رہتی ہے،

میں تو جتنی مرتبہ گیا، وہاں سے روکر اُٹھا، میری تتلی کے کسی نے پر نوچ لیے ہیں۔''

(آندھی آتی ہے، کھڑکیوں کے پٹ زور زور سے بجتے ہیں، بجلی کی کڑک اور پھر بارش)

سلمٰی: ''ایک تو یہ آندھیاں ہم عورتوں کی دشمن ہیں، صفائی کرتے مر جاؤ، سب کیے کرائے پر پانی نہیں گرد پھیر جاتی ہیں، امجد، اوپر والے کمرے کا دروازہ بند کر آئیں۔''

امجد: ''نہیں کرتا ہوں سلمٰی تم جلدی سے منی کے کمرے میں جاؤ، اسی کے پاس رہو، میں بھی آتا ہوں۔۔۔(ذرا سا وقفہ)(اب منی کے کمرے میں، امجد اور سلمٰی وہاں ہیں)۔

سلمٰی: ''میری بیٹی، دودھ لے گی، دودو، جُجو، جُجو، (زبردستی ہنستے ہوئے) میری منّی اِتی سی تھی، کہتی تھی ججو، ججو، آپ اس کے کھلونوں میں سے ججو تلاش کرتے تھے، مجھے پتا ہوتا تھا کہ وہ کیا مانگ رہی ہے، ماں کو پتا ہوتا ہے، باپ یہ رمزیں نہیں سمجھ سکتے۔''

امجد: ''مُنیں منی تو میری بیٹی ہے، میں اسے کہتا تھا کہ منی بتاؤ تم امی کی بیٹی ہو یا ابو کی؟ تو وہ میری طرف اشارہ کرتی تھی۔''

سلمٰی: مرد کو مالک بننے کا شوق ہوتا ہے، بلا شرکتِ غیرے، واحد مالک، قابض، ماں کو پتا ہوتا ہے کہ اسے اولاد کے دل سے، روح سے کبھی بے دخل نہیں کیا جا سکتا، اس لیے وہ اقرار نامے نہیں لکھواتی، مختار نامے نہیں لیتی۔''

امجد: ''عورت، مرد ایک دوسرے کے دشمن یا حریف تھوڑے ہیں، یہ دونوں ہی ایک دوسرے کو معنی دیتے ہیں، منو، منیا، میری بیٹی، جانی، یہ لو، تمہاری پسند کا آم ہے، بڑی مشکل سے تم کو رٹول کو لٹور کہنا چھوڑا تھا، ''لو میری بیٹی''۔

سلمٰی: ''یہ بیٹی کھانے کے لیے ہے، دیکھنے یا رکھ چھوڑنے کے لیے تھوڑی ہے، نہیں نہیں، اچھا تمہاری مرضی، دیکھو، چلو تم لیٹ جاؤ، (چمکارتی ہے) چچ چو، لیٹ جاؤ، میری جان، یہ لو، چادر لو، آنکھیں بند کر لو، ابو تمہارے کہانی سنائیں، یہ کہانیاں سنانے کے ماہر ہیں۔''

امجد: ارے کہاں کے ماہر ہیں، تمہاری تفتیش کے سامنے ہر کہانی بودی ثابت ہوتی رہی ہے۔''

سلمٰی: آپ بھی تو ایک ہی سانس میں تین غلط باتیں کہہ جاتے ہیں۔''

امجد: (ہنس کر) ''گویا ایک سانس میں ایک ہی غلط بات کہی جا سکتی ہے اور آخری سانس میں؟''

سلمٰی: (جذباتی ہو کر) ''ایسی باتیں نہ کریں بدشگونی کی، پہلے ہی منی کی چپ نے گھر کو ویران کر دیا ہے۔''

امجد: ''سو گئی ہے، چلو اچھا ہے، اسے سو لینے دیں، میرا خیال ہے کہ یہ نیند پوری کر لے گی تو اس کی شرارتی ہنسی لوٹ آئے گی۔''

سلمٰی: ''ایک منٹ، میں ذرا چادر اوڑھا دوں اسے، آں میری بیٹی، بس''

(اتنی دیر میں کھڑکی کے پٹ پھر بجنا شروع ہو جاتے ہیں)

امجد: ''یہ کھڑکی، ابھی بند کی تھی، پھر بجنا شروع ہو گئی، اس کا کھٹکا کمزور ہو گیا ہے، کل صبح اسے تبدیل کراتے ہیں، ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں، یہ (کھڑکی کو بند کرنے کی کوشش)، اُوں اب ٹھیک ہے، پر، یہ، یہ کیا ہے، کپڑے کی دھجی ہے، یہ دوپٹے کا ٹکڑا ہے۔''

سلمٰی: ''ہاں یہ چادر نہیں، دوپٹے کا ٹکڑا ہے، دکھاؤ، میرا خیال ہے کہ ہوا سے یہ کسی گلی یا صحن سے اُڑ کر آیا ہوگا۔''

امجد: ''سلمٰی دیکھو، دیکھو، یہ خون کے نشان ہیں، اس پر، خون کے نشان''۔

سلمٰی: ''اب پھر قصّہ گو جاگ رہا ہے، تمہارے اندر، اتنی تیز بارش میں خون کے دھبے کیسے رہ گئے اس دوپٹے کے ٹکڑے پر۔''

امجد: خون کے دھبے دُھلیں گے، کتنی برساتوں کے بعد۔''

سلمٰی: یہ تو واقعی خون کے داغ ہیں، یہ کیسے داغ ہیں، جنہیں بارش اندھی ہو کر بھی نہیں دھو سکی۔''
(ایک عورت کی دردناک چیخ) امجد، امجد آپ نے یہ چیخ سنی ہے، کیسی دردناک چیخ ہے، کس بدنصیب کی آواز ہے، یہ۔''

امجد: ''افسانہ طراز مجھے کہہ رہی تھیں، اب تمہیں دوپٹے کے اس ٹکڑے کے اندر سے چیخیں بھی سنائی دے رہی ہیں۔ میں نے تو نہیں سنی، کوئی چیخ۔''

سلمٰی: ''مرد، یہ چیخ سن نہیں سکتے، سن لیں تو سمجھ نہیں سکتے، سمجھ بھی لیں تو محسوس نہیں کر سکتے۔ ان چیخوں کو کوئی عورت ہی سن بھی سکتی ہے، سمجھ بھی سکتی ہے اور محسوس بھی کر سکتی ہے۔''

امجد: ''دیکھو، دیکھو، تمہاری جذباتی باتیں سن کر منی بھی بے آرام ہو گئی ہے، وہ اُٹھ بیٹھی ہے۔''

سلمٰی: ''اس کا مطلب ہے کہ جو چیخ میں نے سنی، جسے امجد علی شیخ، صاحب سننے سے محروم رہے، اسے اس کی بیٹی نے بھی سنا، (پیار کرتی ہے) سنا ہے ناں میری بیٹی نے؟

عزیز مائی: ''بی بی جی، ابھی ایک چیخ سنی جی آپ نے، ایسی چیخ جس نے میرا ہاں ہی نکال لیا ہے جی، بابا چپ شاہ بھی بول پڑا ہے جی، آج شام سے۔''

سلمٰی: ''چپ شاہ بول پڑا ہے؟ اب میرا خیال ہے کہ میری منی بھی بولنے لگ جائے گی۔''

عزیز مائی: ''کیا ہوا جی نکی بی بی کو؟ اسے کیا ہو گیا جی؟ کیوں نکی بی بی تم ٹھیک تو ہو؟''

امجد: ''منی بالکل ٹھیک ہے، بس ذرا اسے بخار ہو گیا تھا، دوائی لے کر آرام کر رہی تھی، اب پھر سوئے گی، میری بیٹی۔''

سلمٰی: ''عزیز بی بی، مجھے چپ شاہ کے پاس لے جاؤ۔''

عزیز مائی: ''چلیں جی، پندرہ دن سے ہمارے قصبے کی چڑیاں تو چڑیاں کوّے بھی چپ گھڑپ تھے،

آئیں جی، اس کے دِیوں میں تیل ڈال آئیں جی۔''

امجد: ''ابھی دو دن جانا مناسب نہیں، چپ شاہ جب بولنا شروع کرتا ہے تو پھر دو دن تک گالیاں ہی دیتا رہتا ہے۔''

عزیز مائی: ''ناں جی میاں جی، اللہ لوکاں کی گالیاں کوئی گالیاں تھوڑی ہوتی ہیں، ان میں بھی بھید ہوتے ہیں جی، گجھے بھید جی، ہم ان پڑھوں کو تو پتا نہیں چلتا، پر بی بی سمجھ جائے گی۔

امجد: ''سلمٰی، بھید یا رمز صرف اتنا ہے کہ لوگ چپ رہنے کے بعد بولتے ہیں تو پھر گالیاں دیتے ہیں کیونکہ اتنی طویل چپ کے بعد سیدھی سادی باتیں تو نہیں ہو سکتیں۔''
(ہوا تیز ہو جاتی ہے، بارش بھی)

سلمٰی: ''یہ ہوا اور بارش بھی ذرا سی دیر چپ ہو کر پھر بولنے لگے ہیں اونچی اونچی آواز میں، (کھڑکی کا کواڑ پھر بجنا شروع ہوتا ہے)۔۔۔کل مستری بلا کر اسے ٹھیک کرائیں، آپ بیٹھیں، میں اسے بند کرتی ہوں، پھر سے، یہ، یہ امجد دیکھیں، یہ ایک اور ٹکڑا ہے، اسی چادر اور دوپٹے کا، اس پر خون ہے، خون ہے اس پر (عورت کی چیخ دوبارہ سنائی دیتی ہے) یہ چیخ سنی آپ نے امجد؟ اب بھی نہیں سنی، آپ نے؟

امجد: سلمٰی تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے؟ تم لیٹ جاؤ، منی کے ساتھ۔

عزیز مائی: چلو عزیز مائی، ''پر صیب جی، یہ چیخ تھی کس کی؟''

دوسرا منظر:

(ملک صاحب کا ڈیرہ، چہل پہل، پس منظر میں آوازیں، ریچھ کتے کی لڑائی کے لیے تیاریاں، دیگر مشاغل)

ملک صاحب: ''اوئے قووے آ، اوئے رِچھ والے کو بھی دس آدمیوں کی روٹی بھیجنی ہے، اوئے۔''

قووا: ''سرکار، فکر ای نہ کریں، ملک صاحب کے ڈیرے پر روٹیوں کا کوئی کال ہے، آج تائیں، کوئی یہاں بھوکا رہا ہے؟ جو رِچھ والے رہ جائیں گے۔''

ملک صاحب: ''اوئے ٹرٹر نہ کراوئے، ہر وقت لباڑ مارتا رہتا ہے، اوئے میرے کتوں کو مربہ شربہ کھلایا ہے؟ آج عصر ویلے انہوں نے رِچھ کی ناسوں کو توڑنا ہے۔''

قووا: ''ملک صاحب اتنا مربہ کھلایا کہ ان کی شوگر اب چیک کرانی پڑے گی۔''

ملک صاحب: ''اوئے بدشگنے آ، زبان کھینچ کے تلی پر رکھ دوں گا، جادفع ہو جا۔''

قووا: ملک صاحب! سائیں ہم تو ازلی نمک خوار ہیں، آپ کو کبھی ایسی تکلیف نہیں کرنی پڑے گی، بس ہک اشارت کریں گے، آپے آپڑیں زبان کٹ کے سرکار کی تلی پر رکھ دیں گے، ویسے سرکار، غریب کی زبان بھلا کسی کے کیا کام آئے گی۔''

ملک صاحب: ''اوئے منادی وی کروائی اے اپنے رِچھ کتے کی لڑائی کی؟ یا سارے نقارے گِلّے (گیلے) ہوئے پڑے ہیں۔ ہمارے جوتوں اور کھلوں کی طرح، قودے کے سر پر ٹوٹنے کے لیے۔''

قودا: سروی سرکار دی تلی تے! پرتلی دا موگھا کھلا کرانا پوسی۔''

ملک صاحب: ''اوئے، نامراد، باتونی، ونج، دفع ہو، یہاں تھوں۔''

قودا: ''میں تاں سرکار، تواڈے کتوں کا وی نوکر ہوں، میں نے ان کی ابھی مالش کی ہے، رِچھ والا مودا کہہ رہا تھا کہ مچھرا ہوا رچھ ملک کے بُولی کتوں کی نالیاں توڑ کے سب کے سامنے ان کی مکھ کھائے گا۔''

ملک صاحب: ''اوئے میں تم سب کی مکھیں نکال کر اپنے کتوں کے آگے نہیں ڈال دوں گا، یاد رکھو، ان کتوں کی وجہ سے اس در سے تم لوگوں کا نمک لگا ہوا ہے، (موبائل کی گھنٹی کسی گھٹیا فلمی گانے کی طرز پر بجتی ہے) اوئے اُٹھا کے دے، فون میرا، دیدے پھاڑ کے کیا دیکھ رہا ہے، فون میں کوئی مجرا تو نہیں ہو رہا، لا، مجھے دے اور جا کوئی کام شام کر، ہیلو ہاں جی، میں ملک نظام ہی بول رہا ہوں اور کس نے بولنا ہے جی میرے اس فون سے؟ ہاں جی، آپ آ جائیں جی، کل رِچھ کتے کی لڑائی کرا رہے ہیں جی، اس علاقے میں آپ کی طرح کیبل شیبل تو ہے نہیں، بس یہی ورائٹی پروگرام ہیں جی لوگوں کے لیے اور آپ کے لیے وہ سارا بندوبست ہے جو خاندانی لوگوں کی ضرورت کا ہوتا ہے، فکر نہ کریں جی، ہنستا ہے، بس ذرا نکے تھانیدار کو قابو میں رکھیں، وہ ذرا ناواقف ہے ہم سے اور کبھی کبھار اُڈاریاں بھرتا ہے۔ ہاں جی، وہ آپ فکر نہ کریں، مولوی جی کی دو وقت کی روٹی ہمارے در سے جاتی ہے، میں بلا کر سمجھا دوں گا، آپ ذرا نِکے تھانیدار کا خیال کریں، وہ جی، ہم بھی ٹہل سیوا کر دیں گے اس کی، بس آ جاؤ۔''

قودا: ''ملک صیجب، چودھری ناظم کا فون تھا جی۔

ملک صاحب: ''اوئے تم جاسوسی کرتے ہو، میرے ساتھ، میرے اوپر پہرہ دیتے ہو؟''

قودا: ''اقبال بخت کی خیر ہووے جی، رونقاں لگی رہیں سرکار کے ڈیرے پر، اللہ نے آخر اتنا دیا ہے، تو اسے استعمال بھی تو کرنا ہے۔''

ملک صاحب: ''اوئے قودا آ، تمہیں سکول ماسٹر لگوا دوں؟''

قودا: (ہنستے ہوئے) ''سرکار، سکول میں تو آپ نے مرغی خانہ بنا لیا ہے، ہم جیسے لوگ ماسٹر بھی لگ جائیں، وہاں تو بس دانہ ڈالیں گے، مرغیوں اور آپ کے بچوں کو۔''

ملک صاحب: ''اوئے پھر ٹرٹر شروع کر دی تم نے، قودے آ، توں بہت سر چڑھ کے بولتا ہے۔''

قودا: ''ملک صاحب، سرکار سکول بناتی جائے، آپ کے کام آتے جائیں گے۔''

ملک صاحب: ''اوئے بڑا درد ہے تجھے سرکار کا، تیرے سال کے دانے ہی بند کر دوں تو طبیعت صاف ہو جائے تیری اور تیرے گھر والوں کی، اوئے کیا حال ہے تیری جمعدارنی کا؟''

قودا: ''آپ مالک ہیں جی، ہم غریبوں نے کیا شغل کرنا ہے جی، وہ تو نورے نائی نے ایک جگت چلا دی جی ہمارے نام کی۔''

ملک صاحب: ''اچھا، ادھر آ، سن، مولوی کے گھر چلا جا، اس سے کہنا کہ اس جمعے کی اس کی تقریر بے زبان ریچھ کتوں پر تو ہم نے معاف کر دی ہے، آئندہ اس کا 'مڈی بستر' نکلوا دوں گا، اچھی طرح سمجھا دینا۔''

قودا: ''سمجھاؤں گا تو سرکار ضرور میں تو خود وی کافی سمجھ گیاں، آئندہ کوئی خطا نہیں ہوگی۔''

ملک صاحب: ''اور ہاں، سلیم کریانے والے کو بھی میری طرف سے بتا دینا کہ اپنی زبان بند رکھے گا، ورنہ اس کی آنکھیں نکلوا دوں گا، اس طرح عینی گواہ بننے کا اس کا شوق بالکل ختم ہو جائے گا۔''

قودا: ''سائیں، اس کی ایک آنکھ ویسے بھی پتھر کی ہے، وہی جس میں تھوڑی بہت مروت ہے سرکار۔''

ملک صاحب: ''اوئے جگتاں کی کھٹی کھاتے ہو تم، پہلے اب تم جاؤ پہلے تو ملاں شریف کے پاس جاؤ، کہنا رِچھ کتوں کی لڑائی کے بارے میں مسیت میں کوئی بات کی، تو اِدھر سے اس کا گُوچ! سمجھ گئے؟ اور کریانے والے شادے سے کہنا، موقعے کی دکان میں اس لیے بٹھایا ہے کہ دیکھے سب کچھ مگر بولے کچھ نہیں (چھوٹے بچوں کی روں روں، کرلاہٹ) اوئے ہاں یہ فضلے کے بلونگڑے رو رہے ہیں؟ اپنی اماں کے لیے جو پیر فضل شاہ سے تعویذ لینے گئی تھی اور وہاں سے نس گئی۔ فضلے سے کہنا اَسّی ہزار خرچے کا لے آئے، ہم کوشش کریں گے اس کا باز و واپس مل جائے اور ہاں ملک بختاور کو بھیجو، میرے پاس۔''

قودا: نکے ملک کو؟

ملک صاحب: ''اوئے کتنے ملک بختاور ہیں، اس علاقے میں! فضلو، وہیں جا کے بیٹھ ذرا، اوئے ادھر نہ آنا، میرے کتے بکھے پھر رہے ہیں۔ کل شام سے، آپ اپنے جھگوں کی حفاظت نہیں کر سکتے اور روندے کھاندے بال لے کر ملک نظام کے ڈیرے پر آ جاتے ہیں! یہ قودا تمہیں سمجھاتا ہے، خرچہ پانی کا بندوبست کرو، وہ سوئی تو ہے نہیں، اپنی مرضی سے نسّی ہے، تمہیں بابا واپس مل جائے گی، دو ایک ہفتے ذرا اس کے حرام مغز کی مالش ہو جائے، جا، اب، نہ نہ یہ رومال میرے پاس نہ کھولو، قودا جا اوئے اسے لے جاؤ، جا، یہ رقم بھی دیکھ کتنی ہے، جا اب۔۔۔''

(کتے آتے ہیں، ان کی غراہٹ رفتہ رفتہ لاڈ میں تبدیل ہوتی ہے)

ملک صاحب: ''اوئے پترو، تیاری ہے ناں، رِچھ کی ناسوں پر پہلا جھپٹا ہونا چاہیے اور دیکھو رِچھ کے

چک سے بچنا ہے، میرا بولی بچالے گا، تو موتی ذرا بھاری ہو گیا ہے، تیری فکر ہے مجھے، ہاں بھئی، ملک بختاور، سن (آواز آہستہ) چھ ہفتے کے لیے سوات چلے جاؤ، ادھر تو قہر کی گرمی ہے، بس اور بات نہیں، ابھی، وہ تحصیلدار کے لیے جو جیپ لی ہے، وہ لے جانا اور دیکھ بابا اپنے کھیتوں میں چرنے کو بہت کچھ ہے، اِدھر اُدھر ذرا خیال سے منہ مارنا چاہیے، وقت ذرا بدل گیا ہے، اب کی کمین کو بھی زبان لگ گئی ہے، رقعہ لکھتے ہیں اور اخباروں میں آجاتا ہے، بس کہہ دیا، ابھی چھ ہفتے واپس نہیں آیا، آنے سے پہلے میرے تیسرے ٹیلی فون پر رابطہ کرنا، ____ اچھا اللہ کے حوالے اور ہاں یہ گندے نالے والا راستہ ناں لینا، وہ آرہا ہے نکا تھانیدار، نئی نئی وردی کی اکڑ میں ہے، چلو جاؤ، اب'' (موبائل بجتا ہے) ''ہاں بھئی، کانڈھا نہیں ملا ہے یار رِچھ کتے کی لڑائی بھی ہے اور خاندانی لوگوں کا دنگل اور موج میلہ بھی، آجاؤ، کچھ باتیں اور بھی کرنی ہیں، یار تم سے، میں نے چودھری جوڑ توڑ کو بھی بلایا ہے، مخدوم صاحب بھی آئیں گے، کچھ کویلیوں کو پر لگ گئے ہیں، انہوں نے کویلیوں کی کاوڑ پر شعر لکھنے شروع کر دیئے ہیں، خاندانی لوگوں کے منہ آنا شروع ہو گئے ہیں، ٹھتھے اور تبلے سامنے بولنے کی کوشش کرتے ہیں، نئیں نئیں، میں نہیں گھبراتا، ملک نظام کا ناخن ابھی بھی ان کی شہ رگ پر ہے، پر یار اب یہ ہماری پنچایتوں پر بولتے ہیں، صلح صفائی کے لیے ونی کی رسم میں عیب نکالتے ہیں، جو زمینیں ہمارے وڈکوں نے سرکار کو دی تھیں، ان پر اگر وہ مدرسہ یا شفاخانہ بنائیں تو مالک تو ہم ہی ہیں، ان علاقوں میں نہ کوئی باہر کا آدمی اُستاد بن کر آتا ہے نہ ڈاکٹر، یہ عمارتیں بھوت بنگلے بن جائیں، اگر ہم اس میں کچھ وسوں نہ کریں، تھوڑا بہت اَیہٹر رکھنے سے کوئی قیامت تو نہیں آتی، تم آؤ گے تو باتیں کریں گے، نئیں یار، یہ تقریر نہیں، ابھی بھی سارے خاندانی لوگ کھٹے ہو جائیں تو کمی کمین کی مجال نہیں، بلے شک اخبار جو مرضی آئے لکھیں، ان کمیوں کو پڑھنا تو آتا نہیں، اخبار پلے سے لینے کی اوقات نئیں زیادہ سے زیادہ پلوطے نکال سکتے ہیں، نوندریں مار سکتے ہیں، اس سے زیادہ پھڑک نہیں سکتے، (ہنستا ہے) ہاں پھڑکنے کا سواد ہی اور ہے، کئی شکارا کٹھے کئے ہیں، یاد ہے نا؟ ہر شے کا انتظام ہے یار، کہہ جو دیا، اللہ بیلی۔''

(تھانیدار، ایک سپاہی کے ساتھ آتا ہے)

ملک صاحب: ''آؤ، آؤ، جناب، جم جم آؤ، اوئے ادھر موڑھا رکھ اوئے، تھانیدار صاحب کے لیے اور سنو پہلی دفعہ آئے ہیں، خاطر کرو اور وہ دو ڈلیں (ڈل-ٹوکری) آموں کی رکھوا دِو ان کی جیپ میں، ہاں جی شہری مہمانوں کے ساتھ ہم چائے شائے پی لیتے ہیں، چائے لے آؤ اوئے، ساتھ مٹھائی بھی۔''

تھانیدار: ''بس جی، زیادہ تکلیف نہ کریں، جی، ایک مقصد تو آپ سے ملنا تھا، آپ اس علاقے کے بہت

معزز آدمی ہیں۔''

ملک صاحب: ''شکر ہے جی، آپ نے یہ نہیں کہا کہ اس علاقے کے معزز لوگوں میں سے ہیں، پھر ہمیں اَچون ہوتی جو ہمارے علاوہ کون معزز لوگ ہیں، اس علاقے کے، یہ سب ہماری رعایا ہیں جی، ٹھیک ہے، ہمارے قبلہ والد صاحب کی کمزوریوں سے یہاں شہری وسیب زور سے آ گیا، دو، چار سرکاری محکمے کھل گئے، نوکری پیشہ آ گئے، پنساری، کریانہ والے بن گئے، پر ہیں تو جی سارے ہماری رعایا، ہماری زمینوں پر آباد ہیں۔''

تھانیدار: ''زمین تو اللہ کی ہے جی۔''

ملک صاحب: ''اوہو، اللہ کی سہی، پر وہ اپنی مخلوق کے رزق کا بندوبست اپنے گنے چنے خاندانی لوگوں کے ذریعے کرتا ہے ناں جی، اشراف، کمین یہ ساری تقسیم اس کی ہے جی۔''

تھانیدار: ''خیر یہ تقسیم تو انسانوں کی ہے، اس نے تو سب انسان برابر بنائے ہیں۔''

ملک صاحب: ''میں جی بحث میں نہیں پڑتا، خاص طور پر وردی والوں کے ساتھ، پر جی یہیں میرے ڈیرے پر بیٹھ جائیں، ایک گھنٹہ، سب کی شکلیں دیکھتے جائیں، عقلیں دیکھتے جائیں اور پھر سوچیں یہ برابری کی باتیں کتنی ناانصافی کی ہیں۔''

تھانیدار: ''ملک صاحب، ایک تفتیش میں آپ کی امداد درکار ہے، بچیوں کا مدرسہ ہے ناں جی، اس میں ایک بی بی پڑھاتی تھیں، نازیہ، نازیہ خالد، ایک ہفتہ سے وہ لاپتہ ہیں، جی۔''

ملک صاحب: ''آپ خود سمجھ دار ہیں جی، نہیں تو لڑکیوں کے مدرسے کا ہی مخالف ہوں، یہ چار پیسوں کے لیے آجاتی ہیں، نہ کوئی ان کا کردار دیکھتا ہے نہ چھان بین کرتا ہے، جی پیچھے اپنے گھر چلی گئی ہوگی۔

تھانیدار: ''وہ اپنے گھر میں نہیں، یہیں سکول کے ایک کمرے میں رہتی تھیں، سب لوگ ان کی دیانت اور کردار کی تعریف کرتے ہیں، سب لوگ ان کے لیے پریشان ہیں۔

ملک صاحب: جو پریشان ہیں، وہ تھانے پہنچ گئے ہیں، ملک نظام کے ڈیرے پر آئے بغیر، سیدھے؟''

تھانیدار: ''نئیں پھر آؤں گا، اب تو میں تعارف کے لیے آیا تھا، چائے نہیں جی! آپ کے آم کافی ہیں۔''

(چپ شاہ کا تکیہ)

چپ شاہ: ''دیکھو اور چپ ہو جاؤ، میری طرح (دیوانوں کی طرح ہنستا ہے) چپ نہیں رہ سکتے تو چھپ جاؤ، یہ سارے رِچھ ہیں یا پھر کتے، اپنیاں نلیاں نہ تڑواؤ، نہ بکاٹاں مار کے سوئے ہوؤں کو جگاؤ، یہ جو سوئے ہوئے ہیں انہیں نیند پیاری ہے، یہ خود ہمیں پیارے ہیں اور ہم اللہ کے پیارے ہیں، اللہ کے پیارو، دیکھو اور چپ ہو جاؤ، ویسے تو دیکھو بھی ناں، بعد میں پردے رکھنے میں کافی مشکل ہوتی ہے، ایک بکل کی توفیق مانگو، اپنے رب سے۔''

سلیم کریانے والا: سائیں چپ شاہ، جب سے سب کچھ دیکھا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا، دکان بھی بند کر دی ہے، سرکار، سوداسلف لینے اور دینے کو دل نہیں چاہتا۔''

چپ شاہ: سب کچھ کہاں دیکھا تم نے ظالم، ایک منظر کے دیکھنے کو سب کچھ کہتے ہو، ہر منظر کے لیے ایک کلیجہ چاہیے، ہے تیرے پاس کلیجہ، (ہنستا ہے) نہیں ہے ناں؟ بس جب دیکھا نہیں، دیکھا ہے تو سمجھا نہیں تو چپ ہو جاؤ، آپڑیں بھورے میں چلے جاؤ، چھپ جاؤ، کتنی جماعتیں پڑھی ہیں تم نے؟ بھورا جانتے ہو ناں؟''

سلیم: ''بھورا القمہ کو کہتے ہیں، تہہ خانے کو بھی''۔

چپ شاہ: ''بس بھورے آ،، بھورے میں چھپ جا، ورنہ وہ تجھے بھی ٹوٹے ٹوٹے کر دیں گے۔''

سلیم: ''بس جی، اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دے دیں جی، آپ کی خدمت کروں گا جی۔''

چپ شاہ: ''اوئے چپ شاہ کے قدم ہیں ہی نہیں اور نہ یہ خدمتیں کراتا ہے، کسی سے، خدمتوں کی چاہ ہے تو کتوں والے ملکوں کے پاس جا، چاکری کر، ان کی، پھر تیری شکل بھی ویسی ہو جائے گی۔''

سلیم: ''سائیں، انہوں نے بڑی بے دردی کی جی، اس معصوم کے ساتھ، اسے تو جی بس مہندی کے نئے نئے ڈیزائن سیکھنے کا شوق تھا، سب بچے اس سے محبت کرتے تھے، وہ تھی بھی بہت اچھی۔''

چپ شاہ: ''دیکھو اور چپ رہو، نہ دیکھ سکو تب بھی چپ رہو، اس کو سب کی ضرورت ہے، ظالموں کی مظلوموں کی، بے صبروں کی، بھیڑیوں کی، یہ کھیل ورنہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے، بس چپ رہو، مست ہو جاؤ اور جاؤ بھورے میں جاؤ، سونگھنے والے یہاں آ رہے ہیں، جاؤ۔''

قودا: ''چپ شاہ سئیں، آج تو سکی نہر میں روانیاں ہیں جی، تقریراں ہیں جی، ایہہ مزے کلھے ای کلھے''۔

چپ شاہ: ''کلھا تو چپ شاہ کبھی نہیں تھا اور نہ ہوگا، ویسے ہو سکے تو تم بھی اب بس کرو، نا ساں اندر کر لو، کیوں ہلکان ہوتے ہو، کتنا راتب ملتا ہے، تمہیں۔''

قودا: ''بس جی قودے کو اپھرنے جوگا مل ہی جاتا ہے، ادھر سلیم کریانے والا تو نہیں آیا سائیں؟ کہیں غیب ہی ہو گیا ہے؟ پتا نہیں اسے موت نے ڈکھالا دیا ہے یا کچھ اور ہوا ہے، بالکل گم ہو گیا ہے۔''

چپ شاہ: ''ہر ایک کو اپنی خبر بھی نہیں ہوتی، دوسروں کا پتا کہاں سے لگے، پتا لگ بھی جائے تو چپ رہو، بس چپ رہو۔''

قودا: ''بس جی، میں یہی کہنے کے لیے آیا تھا، سلیم کریانے والے سے، آپ خود ہی یہ کہہ رہے ہو تو قودے کی ڈیوٹی ختم جی۔''

چپ شاہ: ''اوئے ہم سے ڈیوٹی بدلنی ہے، تم نے؟''

قودا: ''ناں جی، میں نے مرنا ہے، ہمارا مالک بکھا پیاسا تو نہیں رکھتا اور کپڑا، جوڑی جوتوں کی اور دانے سال بھر کے دے دیتا ہے، وہ تو جی دھن جگرا آپ کا ہے، جو ڈیوٹی دے رہے ہیں۔''

چپ شاہ: ''اوئے بھٹیاری کے دانے ہیں، جو گرم ریت پر بھن رہے ہیں، تماش بینوں کے مزے ہیں، وہ تڑتڑ آوازوں سے، مخلوقِ خدا کی آوازوں سے مزہ لیتے ہیں، مزہ آ بھی رہا ہو، تو چپ رہو۔''

قودا: فکر نہ کریں جی (منہ پر ہاتھ رکھ کر) آپ جیسے دو، چار اللہ لوک ہوں ناں ہر بستی میں، جو چپ رہنے کا مشورہ دیں سب کو، تو تمام قودوں کا کام آسان ہو جائے۔ ابھی مولوی صاحب سے متھا لگا کے آیا ہوں، اس نے عربیاں بول بول کر میرا فلودہ نکال دیا ہے، بس جی سلیم کریانے والے کو آپ ای ٹھپو جی ذرا۔ یہ جی یہ دونا جلیبیوں کا، کوئی آپ کے در پر رکھ گیا ہے، آپ تو اللہ لوک ہیں، بالکل سیّد ہے، جلیبیاں تو ہم جیسے ڈِنگ پھڑنگوں کے لیے ہیں، چلو جی رب راکھا۔''

چپ شاہ: جلیبیاں کھاؤ یا جلیب، بس چپ رہو، (ہنستا ہے) جو دیکھ لیتا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آتا، جس کی سمجھ میں آ سکتا ہے، وہ دیکھتا نہیں، پھر اچھا تو یہی ہے کہ چپ رہو۔''

سلمٰی: ''چپ شاہ، میرے لیے دعا کرو، میرے بیٹی اچھی بھلی سکول گئی تھی، واپس آئی تو بستہ بھی نہیں تھا، پاؤں میں جوتے اور بالوں میں رِبن بھی نہیں، بس چپ ہو گئی ہے، کسی سے نہیں بولتی، اپنی ماں سے بھی نہیں، باپ سے بھی نہیں، کسی سے نہیں۔'' (روتی ہے)

چپ شاہ: ''اچھا کرتی ہے، تم سارے اس معصوم کو بلوا کے کیا کرو گے؟ اسے سب کچھ بھولنے دو، جب بھول جائے گی، آپ سے آپ بول پڑے گی۔''

سلمٰی: ''ابھی تو وہ ہم سب کو، اپنی گڑیوں کو، کھلونوں کو، بھولی پڑی ہے، اس کے ابو نیا بستہ لے آئے ہیں، کھلونے اور کپڑے بھی، مگر وہ کسی کو دیکھتی ہی نہیں، میری معصوم بیٹی کو پتا نہیں کیا ہوا ہے، چپ شاہ، دعا کرو ہماری بولتی منیا، واپس مل جائے۔''

چپ شاہ: ''بی بی، ایک معصوم کے چپ رہنے سے تیرا کیا جاتا ہے؟ اسے ابھی نہ بولنے دے، اس کی چپ اس کی محافظ ہے۔''

سلمٰی: ''چپ شاہ سئیں، ہماری کھڑکی سے ایک دوپٹے (آہستہ، رازداری سے) کے دو ٹکڑے بھی ملے ہیں، جن پر خون کے دھبے ہیں، اسے غور سے دیکھیں تو ایک عورت کی چیخیں آتی ہیں، اس میں سے'' (وہی چیخ سپر امپوز ہوتی ہے)

چپ شاہ: نہ چُھو ا اس دوپٹے کو، نہ خون کے دھبوں سے کہو کہ وہ بولیں، بس بے حرمتی اور نہ کر اس معصوم کی، چپ رہو اور خاموشی کو سننے کی بھی کوشش نہ کرو، (ہنستا ہے)

سلمیٰ: ''بابا چپ شاہ، میں چپ ہو جاتی ہوں، میرے حصے میں سے میری بیٹی بولنے لگ جائے، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

چپ شاہ: ''وہ بولے گی تو پھر تو بھی میری طرح کہے گی چپ ہو جاؤ، اوئے کتوں کے چاکر، آ جا بھئی، تیرا بھی راتب آنے والا ہے۔''

قودا: ''چپ شاہ، وہ آیا تو نہیں سلیم کریانے والا؟''

چپ شاہ: ''تو دوبارہ تو نہیں آیا، اصل میں تو نگرانی کر رہا تھا، میری، چپ کر جا، صفائیاں نہ دے اور نہ پیچھے لگ، اس ڈرپوک کے، اس کی آدھی جان تو ویسے نکلی ہوئی ہے (ہنستا ہے) جا، بی بی، اب تو جا۔''

سلمیٰ: ''یہ جی میرے چاندی کے کنگن ہیں، رکھ لیں اور میرے لیے دعا کریں۔''

چپ شاہ: ''اوئے عقل کی پوری سوری، نذرانے بیچ میں رکھ کر دعائیں تھوڑی ہوتی ہیں، سودے ہوتے ہیں، جا چپ ہو جا، کنگن بجاتی گھر جا، وہ بولنے لگے گی تو خود ہی ڈر کے کہے گی چپ ہو جا، بہروں کی بستی میں چپ رہنا ہی اچھا ہے۔''

قودا: ''چپ شاہ، کبھی کبھی تیری باتوں سے شک ہوتا ہے کہ تو خفیہ پولیس کا آدمی ہے، کبھی لگتا ہے تو ڈونگا آدمی ہے اور کبھی لگتا ہے کہ کھسکا ہوا بندہ ہے، میری طرح کا۔

چپ شاہ: ''میں یہ سب کچھ ہوں (ہنستا ہے) پھر بھی کہتا ہوں اب بس کر دے، کتوں کی چاکری بس کر دے۔''

قودا: ''بس جی، رِچھ کتے کی یہ آخری لڑائی ہے جی، سرکاری نوکری ہوتی تو پنشن پر چلا جاتا۔''

(تھانیدار آتا ہے)

تھانیدار: ''ہاں بھئی، چپ شاہ تم ہو؟''

قودا: ''ہاں جی، یہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں؟''

تھانیدار: ''کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں؟ اور تم کیا شے ہو بھئی۔''

قودا: ''میں عبدالقدوس ہوں، ویسے مجھے قودا کہتے ہیں، میں منیجر لگا ہوا ہوں ملک نظام صیحب کا۔''

تھانیدار: ''پھر تو تمہیں پتا ہوگا کہ جو استانی مدرسے سے غائب ہوئی ہے، اسے کس نے اغوا کیا ہے؟''

قودا: ''توبہ جی توبہ، ہم خود ماؤں بہنوں والے ہیں جی، ایسا کام اس علاقے میں نہیں ہوتا۔''

تھانیدار: تم لوگ چوریاں کراتے ہو، مویشی کھلواتے ہو، عورتیں اُٹھاتے ہو، قتل کراتے ہو، پھر پنچایتیں کر کے فیصلے کرتے ہو، مجھے پتا ہے تم لوگوں کے کرتوتوں کا۔''

قودا: ''اللہ، توبہ، اللہ توبہ، تھانیدار جی، آپ کے کان کسی نے بھر دیئے ہیں، ہم لوگ خاندانی لوگوں کے جدی پشتی نوکر ہیں جی، وہی اشرافت، ہمارے اندر بھی ہے۔''

چپ شاہ: ''یہ دوسری دفعہ ہے کہ توبہ کا لفظ اس کے منہ سے نکلا ہے، بس اب اسے معاف کریں، یہ چپ رہے گا اب شرمندہ شرمندہ پھرے گا اور چپ رہے گا۔''

تھانیدار: ''سرپنچ نہ بن اوئے چپ شاہ، تُو تو بہت بولتا ہے، پتا نہیں کس نے تیرا نام چپ شاہ رکھ دیا ہے؟''

سلیم کریانے والا: (سہمی آواز میں) ''میں آ جاؤں، چپ شاہ، ہر کوئی چلا گیا ہے؟''

قودا: ''اوئے تو اِدھر تھا؟ چپ شاہ، توں تو اللہ لوک تھا، توں نے بھی ہم جیسے کوڑ پلال مارنے شروع کر دیئے ہیں؟''

چپ شاہ: ''ایک بھورے سے ایک بھورے کی خاطر یہ بھورا باہر آیا ہے۔''

تھانیدار: ''اوئے تم کون ہو؟''

سلیم کریانے والا: ''میں جی محمد سلیم کریانے والا ہوں، جنرل سٹور ہے جی میرا، آٹھ جماعتیں بھی پڑھا ہوں جی۔''

تھانیدار: ''اوئے تیری گم شدگی کی بھی رپٹ لکھوائی گئی ہے، تیری گھر والی نے۔''

سلیم کریانے والا: ''میں تو اسے بتا کر آیا تھا۔''

چپ شاہ: ''بس وہ چپ نہیں رہ سکی ناں۔''

قودا: ''اوئے تم نے کیا جرم کیا ہے، جو یوں لُکتا چھپتا پھرتا ہے۔''

سلیم کریانے والا: ''اصل میں مَیں نے اسے دیکھا تھا، ایک کاکی سکول کی بھی اس کے ساتھ تھی۔''

تھانیدار: ''اسے نازیہ، نازیہ خالد کو دیکھا تھا، تم نے؟ کب، کس وقت اور کہاں، جلدی بول شاباش''۔

قودا: ''یہ جی بھنگ شنگ پیتا ہے اور ادھر اس ڈیرے پر تو 'ساوی' کی کمی نہیں۔''

تھانیدار: ''اوئے قانون میں رکاوٹ نہ ڈال اوئے، زبان کھینچ لوں گا، اگر بولا، اوئے چپ شاہ، تو چپ رہنا، اب، ہاں بھئی سلیم تم اپنا بیان لکھواؤ مجھے۔''

سلیم کریانے والا: ''میرے پاس بیان تو نہیں ہے جی، بس جی اسے مہندی کا شوق ہے، وہ میری دکان سے مہندی لینے آئی تھی۔

تھانیدار: ''اب بیان نہ بدل، تو نے اسے دیکھا تھا کچھ لوگ اس کا پیچھا کر رہے تھے، بول ورنہ تھانے جا کر بولے گا؟''

سلیم کریانے والا: (رونے لگتا ہے) ''میں نے جی کچھ نہیں دیکھا، اس کا پیچھا کوئی نہیں کر رہا تھا، نکے ملک کا تو تعلق واسطہ ای نئیں جی، اس قصے سے، میں اللہ راسی ہوں۔ کوئی میرے آگے پیچھے نہیں، یہ قودے اوری تو میری بوٹیاں کتوں کو کھلا دیں گے اور ہڈیاں جلا کر سرمہ کریں گے اور اپنی آنکھوں میں ڈال کر وہ نشان بھی مٹا دیں گے۔''

قودا: ''توبہ جی توبہ، ہم اس طرح کے سرمے کو کیا کریں گے، اوئے بتاتا کیوں نہیں کہ تو نے کیا دیکھا، کیا نہیں دیکھا! زبان سے پکوڑے اور جلیبیاں بنا رہا ہے، سیدھی بات کر۔''

تھانیدار: ''اوئے تم تفتیشی افسر نہ بنو، ہاں کرو مجھ سے بات، سلیم تم نازیہ کو پہچانتے ہو؟''

سلیم کریانے والا: ''جی میں نے کہا نا کہ وہ زیادہ تر مہندی لینے میری دکان پر آتی تھی، یا خالی لفافے، بڑی اچھی بی بی تھی۔ اس کے ساتھ ایک کاکی بھی تھی، جب۔۔۔'' (منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ہے)

تھانیدار: ''تھی؟ تو تمہیں پتا ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے؟''

قودا: قتل؟ توبہ، توبہ، اس علاقے میں قتل؟ اس علاقے میں ماؤں بہنوں کی بڑی عزت ہے۔''

تھانیدار: ''اوئے تم چپ کرتے ہو کہ لگاؤں ہتھکڑی، تفتیش میں رکاوٹ ڈال تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا، چلو سلیم، تم میرے ساتھ تھانے؟''

سلیم کریانے والا: ''تھانے؟ نہیں جی میرا تو کوئی قصور نہیں، میں تو جی بالکل بے گناہ ہوں نہ میں نے کچھ دیکھا اور اور نہ کچھ بتایا، میرے تو بچے اور بیوی گھر میں میرا انتظار کر رہے ہیں، چپ شاہ، تو انہیں منع کر، تیرے ڈیرے سے یہ مجھے لے جا رہے ہیں، چپ شاہ تو پھر چپ ہو گیا ہے؟''

قودا: ''چپ شاہ نے چھو مار لیا ہے، سمجھ دار ہے، سلیم تم بھی میرے خیال میں سمجھ دار ہو۔''

تھانیدار: ''اوئے قودے، دھمکیاں نہ دے اوئے استغاثے کے گواہ کی، چل بھئی سلیم، اپنا بیان لکھوا۔''

مونتاژ

(i) بہت سی چڑیوں، پرندوں کی آوازیں، جو رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتی ہیں۔

(ii) ریچھ اور کتے کی لڑائی کا تاثر، کتوں کا بھونکنا، کبھی کبھار ریچھ کے قابو میں آ کر چیخنا اور ریچھ کا غرانا اور آخر میں بلبلانا، تماش بینوں کی آوازیں، نقارے، ڈھول، تقیری۔

(iii) قتل ہونے والی نازیہ کی چیخیں

(iv) ملک نظام کے تین، چار مکالمے

''اوئے ملاں شریف کے پاس جاؤ اور کہو اس جمعے کی اس کی تقریر رِچھ کتوں پر تو ہم نے معاف کر دی، آئندہ اس کا مڈی بستر انکلوا دوں گا، یہاں سے۔''

''فضلے سے کہنا، اَسّی ہزار خرچے کا لے آئے، ہم کوشش کریں گے، اس کا باز و واپس مل جائے۔''

''دیکھو بابا ملک بختاور، اپنے کھیتوں میں چرنے کو بہت کچھ ہے، اِدھر اُدھر خیال سے منہ مارنا چاہیے، وقت ذرا بدل گیا ہے، اب کی کمین کو بھی زبان لگ گئی ہے۔ چھ ہفتے کے لیے سوات چلے جاؤ۔''

''یہ اب خاندانی لوگوں کے منہ آنا شروع ہو گئے ہیں، ابھی بھی سارے خاندانی لوگ کٹھے ہو جائیں تو کمی کمین کی مجال نہیں۔۔۔ وہ زیادہ سے زیادہ پلوطے نکال سکتے ہیں، نوندریں مار سکتے ہیں، اس سے زیادہ پھڑک نہیں سکتے۔''

(v) قتل ہونے والی نازیہ کی چیخ

(vi) چپ شاہ ''نہ چھوا، اس دوپٹے کو، نہ خون کے دھبوں سے کہو کہ وہ بولیں۔۔۔ اپنیاں نلیاں نہ تڑواؤ، نہ بکاٹاں مار کے سوئے ہوؤں کو جگاؤ، یہ جو سوئے ہوئے ہیں انہیں نیند پیاری ہے، یہ خود ہمیں پیارے ہیں، اللہ کے پیارو، دیکھو اور چپ ہو جاؤ۔''

(vii) قودا: ''آپ جیسے دو چار اللہ لوک ہوں ناں ہر بستی میں جو چپ رہنے کا مشورہ دیں، سب کو تو تمام قودوں کا کام آسان ہو جائے۔''

(viii) سلیم کریانے والا: ''وہ زیادہ تر مہندی لیتی تھی یا خالی لفافے میری دکان سے، بڑی اچی بی بی تھی، اس کے ساتھ ایک کاکی بھی تھی، جب۔۔۔''

(ix) تھانیدار: ''اب بیان نہ بدل، تو نے اسے دیکھا تھا، کچھ لوگ اس کا پیچھا کر رہے تھے بول، ورنہ تھانے جا کر بولے گا۔''

''اوے تم لوگ چوریاں کراتے ہو، مویشی کھلواتے ہو، عورتیں اُٹھاتے ہو، قل کراتے ہو، پھر پنچایتیں کر کے فیصلے کرتے ہو، مجھے پتا ہے، تم لوگوں کے کرتوتوں کا۔

(xi) امجد: ''مجھے تو شاید وہ پہچان بھی نہیں رہی، عجیب طرح سے بالکل اجنبیوں کی طرح دیکھتی رہتی ہے، میں تو جتنی مرتبہ گیا، وہاں سے روکر اُٹھا، بری تتلی کے کسی نے پر نوچ لیے ہیں۔''

سلمٰی: میری بیٹی اچھی بھلی سکول گئی تھی، واپس آئی تو بستہ بھی نہیں تھا، پاؤں میں جوتے اور بالوں میں ربن بھی نہیں، بس چپ ہو گئی ہے۔ کسی سے نہیں بولتی، اپنی ماں سے بھی نہیں، باپ سے بھی نہیں، کسی سے نہیں۔'' (روتی ہے)

سلیم کریانے والا: ''اس کے ساتھ ایک کاکی بی تھی، جب۔۔۔''

(تحت اللفظ) ''مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا۔۔۔

اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خود پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

ملک نظام: ''پھڑکن کا سواد ہی کچھ اور ہوتا ہے۔۔۔اوئے تھتھے اور تبلے سامنے بولنے کی'' کوشش کرتے ہیں، ئیں ئیں، میں نہیں گھبراتا، ملک نظام کا ناخن ابھی بھی ان کی شہ رگ پر ہے، پر یار، اب یہ ہماری پنچایتوں پر بولتے ہیں، صلح صفائی کے لیے ونی کی رسم میں عیب نکالتے ہیں، جو زمینیں ہمارے وڈکوں نے سرکار کو دی تھیں، ان پر اگر وہ مدرسہ یا شفاخانہ بنائیں تو مالک تو ہم ہی ہیں، ان علاقوں میں نہ کوئی باہر کا آدمی اُستاد بن کر آتا ہے، نہ ڈاکٹر، یہ عمارتیں بھوت بنگلے بن جائیں، اگر ہم اس میں کچھ وسوں نہ کریں۔''

چپ شاہ: ''تم سارے اس معصوم کو بلوا کر کیا کرو گے؟ اسے سب کچھ بھولنے دو، جب بھول جائے گی، آپ سے آپ بول پڑے گی۔'' (نازیہ کی چیخ)

(سلمیٰ امجد، متنی کا گھر)

سلمیٰ: (خوش ہو کر) ''آج اس نے دلیہ کھایا ہے، منہ ہاتھ بھی خوشی خوشی دھلوایا ہے، اب اس کی انگلیوں اور آنکھوں نے بولنا شروع کیا ہے، کاغذوں پر پنسل ورک بھی شروع کیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ اب وہ بولے گی۔''

امجد: ''مجھے تو پہلے یقین تھا کہ وہ بولے گی، بس تم ذرا مایوس ہو گئی تھیں۔''

عزیز مائی: منی بی بی کو اور ورقے لا دیں، سارے بھر گئے ہیں، آپ کی دراز سے نکال کر دے دوں!''

امجد: ''ہاں ہاں، عزیز مائی، وہاں سے نکال کے دے آؤ اور سنو جو اس نے لکھا ہے یا اس پر تصویریں بنائی ہیں، وہ لے آؤ، اُٹھا کے۔''

عزیز مائی: صدقے تھیواں، وہ ناراض نہ ہو جائے۔''

سلمیٰ: دیکھو، اسے ناراض نہ کرنا، اگر ضد کرے تو وہ کاغذ نہ اُٹھانا، جاؤ اور چائے بھی لے آؤ۔''

امجد: ''ڈاکٹر رؤف (رُک جاتا ہے) وعدہ کر کے گیا تھا کہ واپسی پر ہماری منی کو کچھ Sittings دے، مگر وہ خود ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔''

سلمیٰ: ''کیا ہوا؟ کیسے؟''

امجد: ''ایک حادثہ، ایسا سفر جو سب وعدوں سے آزاد کر دیتا ہے، مگر میرا خیال ہے کہ اس کی بے چین روح اسے منی کے کمرے تک لے آئی ہو گی، کیا پتا وہ اسی جہ سے نارمل ہو رہی ہو۔''

سلمیٰ: (ہنستے ہوئے) ''میرے وہموں پر ہنسا کرتے تھے، اب خود یہ باتیں کر رہے ہیں۔''

عزیز مائی: ''یہ ہیں جی، منی بی بی کے سامنے سے اُٹھائے ہیں، جی، میرا خیال ہے کہ وہ راضی تھی کہ آپ یہ دیکھ لیں۔''

سلمیٰ: ''اچھا تو میری بیٹی نے کیا ڈرائنگ کی ہے؟ مہندی کے ڈیزائن ہیں، اس سارے صفحے پر۔''

امجد: (اداس ہو کر) ''اس نے ڈیزائن کے ہر ستارے اور پھول کو زخمی دکھایا ہے، یہ دیکھو خون کے قطرے ہر ستارے اور پھول سے ٹپک رہے ہیں۔''

سلمیٰ: ''نہیں، ایسے نہیں، ہاں شاید، ہاں ایسا ہی ہے۔''

امجد: ''اور یہ کون ہے، تین خاکے، اچھا ایک چادر والی لمبی خاتون، ایک سکول جاتی بچی اور یہ پیچھے کوئی جانور، کتے کی تھوتھنی ہے، پر جسم ریچھ جیسا۔''

سلمیٰ: ''یہ چادر، دوپٹہ ہے، دوپٹے کے پھر ٹکڑے ہیں، ہر ٹکڑے پر خون ہے اور اس صفحے پر صرف خالی لفافے ہیں۔''

امجد: ''سلمیٰ، یہ منی نازیہ، نازیہ خالد کے ساتھ تو نہیں تھی، سکول سے واپسی پر، اور وہ نازیہ سچ مچ قتل تو نہیں ہو گئی؟ اور کہیں یہ سارے منظر کو دیکھ کر ڈر تو نہیں گئی؟''

سلمیٰ: ''امجد، ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو، یہ ننھی سی جان، یہ سب کچھ کیسے دیکھ سکتی ہے؟ مگر اس کا اس سے پیار بڑا تھا، پر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا پتا، وہ ناراض ہو کر چلی گئی ہو، مگر بارش والی رات پھر عورت کی چیخیں کیوں سنائی دیتی تھیں، ہمیں، عزیز مائی، یہ نکالو ناں الماری سے، یہ اوپر والے خانے سے ایک لفافہ، یہ نہیں، وہ والا، اور جاؤ یہ منی کے کمرے میں رکھ آؤ۔''

امجد: ''اِس میں دوپٹے کے ٹکڑے ہیں؟ اب پھر ماں سے زیادہ تمہارے اندر کا تفتیشی افسر جاگ رہا ہے۔''

سلمیٰ: جاؤ، رکھ آؤ، گھر اس طرح کہ اسے پتا نہ چلے، وہ خود کھولے تو کھولے۔''

امجد: ''جلدی نہ کرو، پھر سے وہ ڈر نہ جائے!''

سلمیٰ: ''یہ ڈرائنگ ہمیں بھیج کر اس نے ہمیں کچھ بتانے کی کوشش کی ہے، اب ہمیں، معصوم سے دل کو بوجھ سے آزاد کرنا چاہیے۔ یوں لگے کہ ہم اس کے راز سے واقف ہیں۔''

امجد: ''نیم حکیم خطرۂ جان! ذرا آہستہ چلو، وہ ڈر نہ جائے، عزیز، یہ لفافہ ابھی یہیں رکھ دو اور تم جاؤ، شاباش چائے لے آؤ۔ جلدی، اور سنو پہلے منی کو جوس پلا دو، پھر اس کا موڈ ہو تو یہیں لے آؤ، ورنہ ہم اس کے پاس چلے جائیں گے۔''

سلمیٰ: ''وہ جتنی لگن سے ڈرائنگ کر رہی ہے، ابھی اسے کرنے دیا جائے، تو اچھا ہے، میں نے ایک منّت مانی تھی، کہیں سے کالا بکرا لا دو۔''

امجد: ''کالی مرغی کافی نہیں؟''

سلمیٰ: ''مکرو نہیں! ایسی چیزوں کو ٹالتے نہیں۔''

(امجد کے موبائل کی گھنٹی بجتی ہے)

امجد: ''دھمکیوں والے فون آنے شروع ہو گئے ہیں، ہیلو، ہیلو، جی میں امجد شیخ بول رہا ہوں، نہیں،

وہ ابھی اس قابل نہیں، وہ کافی بیمار ہے۔ جناب، وہ چھوٹی سی بچی ہے، اس کا آپ کی تفتیش سے کیا تعلق! نہیں جناب وہ کسی حادثے کی وجہ سے Sense of Shock میں نہیں، بلکہ ایسے موسم میں اس کی ایسی حالت ہو جاتی ہے، آپ نے آنا ہے تو مہربانی کر کے تین، چار دن موسم میں اس کی ایسی حالت ہو جاتی ہے، آپ نے آنا ہے تو مہربانی کر کے تین، چار دن کے بعد ہمیں بتا کر آیئے، معاف کیجئے ہم تعاون کر رہے ہیں مگر Not on the cost of my child، اپنی بچی کی جان ہمیں عزیز ہے، وہ آئی ہیں، اتنی دُور سے، بھجوا دیں جی، وہ میری بیٹی کی Favourite Teacher کی والدہ ہیں، وہ ہمارے گھر میں رہ سکتی ہیں، اچھا آپ نے انہیں بھیج دیا ہے، مگر آپ کے سپاہی ابھی اس گھر کے اندر نہیں آئیں گے، میں اپنی بچی کو خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ دیکھو نازیہ خالد کی بوڑھی والدہ کریم بی بی آئیں ہیں، وہ ایک دو دن ہمارے گھر میں ہی رہیں گی، لیکن ان سے درخواست کرنی ہوگی کہ وہ اونچی آواز میں یہاں نہ روئیں۔''

(اتنی دیر میں اونچی آواز میں رونے کی آوازیں)

عزیز مائی: ''ہائے ہائے ظالموں نے ڈکرے کر دیئے جی ماسٹرانی جی کے، بوری کے اندر نکلے ہیں، ہائے ککھ نہ رہے ان کا، مدرسے کو قبرستان بنا دیا، ان نامرادوں نے، ہائے کیسی حوروں ایسی معصوم تھی یہ ماسٹرانی، اللہ کی پاک مخلوق تھی، اس نے جلدی اپنے پاس بلا لیا اور جو زمین کا بوجھ ہیں، وہ ویسے ہی پھرتے ہیں۔''

سلمٰی: 'عزیز مائی' حوصلہ! صبر، اور دیکھ منی نہ گھبرا جائے اس آہ وزاری سے، آواز آہستہ رکھ، لے آ، ان کی امی کو عزت سے لے آ، گھر میں، آئیں آپا جی آئیں، ہائے کس موقع پر آپ آئیں، حالانکہ ہم سب کو شوق تھا آپ سے ملنے کا۔

کریم بی بی: ''اوئے ظالمو، کیا کر دیا، تم نے، میری بیٹی کو تو اُجالے پھیلانے کا شوق تھا، تم لوگوں نے اسے اندھیرے کے حوالے کر دیا، اوئے ہوئے، کیا کر دیا تم لوگوں نے، ذرا بھی مہر اور رحم نہ آیا ظالموں کو۔''

سلمٰی: ''آپ نازیہ کی والدہ ہیں، ابھی معلوم ہوا ہے، بہت افسوس ہوا ہے، میری بیٹی کی وہ اُستاد تھیں اور میری بھی بیٹیوں کی طرح تھیں۔''

کریم بی بی: ''اوئے یہاں کے لوگ اتنے بے رحم ہوں گے، کسی ماں نے کبھی ایسا سوچا نہ ہوگا، وہ تو چھوٹی تھی تو دیئے اور موم بتیاں ایک لگن میں رکھ کر نہر میں چھوڑ دیتی تھی کہ جس طرف یہ جائے گا۔ روشنیاں ہی روشنیاں ہو جائیں گی، واہ بھئی روشنیاں دینے والوں کا یہ حشر کیا تم نے؟ (روتی ہے)

امجد: ''بہن جی، آپ ہمیں اپنے غم میں شریک سمجھیں، آپ یقین رکھیں، ان ظالموں کو سزا ضرور ملے گی، یہ سارا قصبہ عزت کرتا تھا، اپنی اس قابلِ فخر بیٹی کی، لوگ آسانی سے اس ظلم کو معاف نہیں کریں گے۔''

کریم بی بی: ''میں تھانے گئی تھی، تھانیدار کہتا تھا کہ کھرا جدھر جاتا ہے، ان کے خلاف کوئی گواہی دینے والا نہیں، سارے ڈرتے ہیں ان ظالموں سے۔''

امجد: ''نہیں بہن جی، ظلم کے خلاف گواہی تو جہاد ہے، آپ فکر نہ کریں اس علاقے کے لوگوں میں غیرت ہے، یہ آپ کے ساتھ مل کر ظالم اور مجرم کو سولی پر لٹکائیں گے۔''

کریم بی بی: ''میری معصوم کے ٹوٹے لے گئے ہیں، رپورٹ کے لیے، پہلے میں نے کہا تھا کہ کریم بی بی اپنی امانت لے جا اور باپ دادے کے ساتھ اسے دفن کر دے، مگر یہ سوچ کر بیٹھ گئی ہوں کہ بِن باپ کی اس بچی کا خون کیوں معاف کروں، جس دھرتی پر گرا ہے، اس پر قرض ہے میرا اور میری بیٹی کا۔''

امجد: ''لیجئے، یہ آپ پانی پی لیں اور تھوڑا آرام کر لیں، میری چھوٹی سی بیٹی ہے، وہ اپنی استانی کے ساتھ بہت Attached تھی، وہ یہ سنے گی تو وہ اور بیمار پڑ جائے گی۔''

کریم بی بی: ''ہائے مجھے اس کے پاس لے جاؤ، کہتے ہیں کہ سکول سے وہ اس کے ساتھ ہی چلی تھی۔''

سلمٰی: نہیں جی نہیں، آپ کو کسی نے غلط بتایا، وہ تو ذرا سی لڑکی ہے، اتنا کچھ کیسے دیکھ سکتی ہے؟

(منی کمرے میں آتی ہے)

منی: ''آپ میری مِس کی امّی ہیں؟'' (روتے ہوئے گلے ملتی ہے)

کریم بی بی: ''ہائے میں صدقے، میری جان، آ جا میرے کلیجے سے لگ جا، تم ساتھ تھیں میری نازیہ کے، جب سکول سے نکلے تو؟''

منی: (روتے ہوئے) ''ہاں میں ان کے ساتھ تھی، جب مونچوں والے ملک نے اُٹھا کر انہیں اپنی جیپ میں ڈالا، انہوں نے بھی شور مچایا، میں نے بھی، مگر مجھے انہوں نے لاٹھی مار کے گرا دیا اور مِس کو ساتھ لے گئے، مِس کا دوپٹہ ان کے پاؤں اور جیپ کے دروازے میں پھنسا ہوا تھا، ان کے ساتھ دو لوگ اور بھی تھے۔''

امجد: ''میری بیٹی، میری جان، اب ایسی باتیں نہ کرو وہ بڑے ظالم لوگ ہیں، (فون کی گھنٹی بجتی ہے) ہیلو، دیکھو، بات سنو، نہیں ایسا نہیں، وہ تو بہت چھوٹی سی بیٹی ہے میری، نہ وہ بڑی باتیں کہہ سکتی ہے، نہ دیکھ سکتی ہے، بابا ہم یہ قصبہ چھوڑ کے چلے جائیں، دیکھو ہمیں کچھ نہ کہو، دیکھو کہہ دو ان سے ہمیں ایک ہفتہ دے دیں، میں یہاں سے تبادلہ کرا لوں گا۔''

سلمٰی: ''کون ہے، کون تھا؟''

امجد: (آہستہ سے) ''دفع کرو، تم خیال رکھو منی کا، دیکھو میرا بیٹا، تم نے کچھ نہیں دیکھا، دیکھئے بہن جی، آپ کے پاس ماں کا دل ہے، آپ اس وقت درد کو محسوس کر سکتی ہیں، ہمارا کل سرمایہ یہ ہماری بیٹی ہے جو آپ کی بیٹی کو بہت پیاری تھی، یہ لوگ کتوں والے ہیں، ریچھوں سے لڑائیاں کرتے ہیں، ان کے نوکر چاکر ظلم کے کارندے، بغیر محنت کے پیسہ سب کچھ ہے، ہم لوگ بھلا ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں، بیٹی تم نے کچھ نہیں دیکھا، سنا میری جان (روتا ہے) تم نے کچھ نہیں دیکھا، میرا بیٹا، چپ ہو جاؤ، پھر سے چپ ہو جاؤ۔''

سلمیٰ: ''منی، میری بیٹی، اپنے ابو کی باتیں سنی ہیں ناں تم نے، تم نے میری جان واقعی کچھ نہیں دیکھا، سنا ہے ناں تم نے!''

منی: ''امی میں نے دیکھا ہے، میں کیا کروں، میں نے دیکھا ہے، اپنی مِس کو روتے اور مدد کے لیے آوازیں دیتے اور سنا ہے انہیں روتے اور پاگل ہوتے دیکھا ہے۔ کتوں والوں کو، ابو آپ کہتے تھے سچ بولا کریں، اَب مجھے کیوں منع کرتے ہیں؟ (روتے ہوئے)

امجد: بیٹی، ہمارا سب کچھ تم ہی ہو، بس تم نے کچھ نہیں دیکھا، کچھ بھی نہیں دیکھا۔

کریم بی بی: ''اِدھر آ، میری بیٹی، ادھر آ، میرے پاس، جو بوجھ بڑے بڑے نہیں اُٹھا سکتے، وہ میری ننھی معصوم جان پر کیسے ڈال دوں، تم نے واقعی کچھ نہیں دیکھا، ہم جیسے لاوارثوں کے لیے ایک ہی عدالت ہے۔ بیٹا، وہی سنے گا، تم بیٹی اپنے ماں باپ کا کہا مانو اور میرا بھی، (رونے لگتی ہے)

عزیز مائی: اوہ جی، تھانیدار صحیب آئے ہیں۔''

تھانیدار: ''سلام جی، ہاں بھئی بے بی کیا حال ہے، بیٹی تمہارا؟''

سلمیٰ: ''یہ بیمار ہے اور جس کام سے آپ یہاں آئے ہیں، یہ وہ نہیں کر سکتی۔''

تھانیدار: ''دیکھیں جی، سچ کا ساتھ دینا مشکل کام، پر جو لوگ یہ کام کر لیتے ہیں، وہ بہت ہمت والے ہوتے ہیں۔''

سلمیٰ: ''ہم میں ہمت نہیں ہے، اور نہ ہی میری بچی میں۔ خدا کے لیے ہمارا پیچھا چھوڑ دیں۔''

تھانیدار: آپ ہمارا ساتھ دیں، فکر نہ کریں، قانون آپ کی حفاظت کرے گا۔''

سلمیٰ: ''قانون کو تو خود حفاظت کی ضرورت ہے، وہ کیا ہماری حفاظت کرے گا۔''

تھانیدار: ''اگر آپ لوگ ہماری امداد نہیں کریں گے، تو پھر کون کرے گا۔''

عزیز مائی: ''بی بی جی، وہ چپ شاہ آیا ہے، کہتا ہے کہ وہ گواہی دے گا، اور اس کے ساتھ سلیم کریانے والا بھی ہے۔''

کتابوں پر تبصرے

قاضی جاوید

نام کتاب : تاریخ کا فریب
مصنف : محبوب صدا
صفحات : ۱۲۷
قیمت : درج نہیں ہے
ناشر : کرسچن سٹڈی سنٹر، راولپنڈی

انیسویں صدی کے اوائل کے جرمن فلسفی ہیگل کو سب سے بڑا فلسفیٔ تاریخ ماننے میں کم لوگوں کو تامّل ہوگا۔ مارکس کو بھی اُس کی عظمت کا احساس تھا۔ البتہ وہ یہ کہتا تھا کہ ہیگل نے تاریخ کو الٹا لٹکا رکھا تھا جب کہ خود اُس نے تاریخ کا رخ سیدھا کر دیا ہے۔ خیر، میں یہاں اِن دونوں بڑے فلاسفۂ تاریخ کے اختلافات کا ذکر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ہیگل تھا جس نے سب سے پہلے تاریخ کی فریب کاری کا ذکر کیا تھا۔ اُس کا دعویٰ یہ تھا کہ تاریخ جب کسی شخص سے کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے تو اپنے اُس مقصد کو اس قدر دل کش بنا کر پیش کرتی ہے کہ وہ فرد اُس کو اپنا آدرش بنا لیتا ہے اور پھر اپنی تمام توانائیاں اُس کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے صرف کر دیتا ہے۔ اُس کی زندگی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وقف ہو جاتی ہے اور وہ اس راہ میں حائل تمام مشکلات کو ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے لیکن جونہی وہ مقصد حاصل ہوتا ہے، تاریخ اُس فرد کو سوکھے پتے کی طرح زندگی کے ہرے بھرے درخت سے گرا کر فنا کر دیتی ہے۔

ہیگل کے نزدیک یہ تاریخ کی فریب کاری (Cunning of History) ہے جس کے ذریعے وہ اپنے مقاصد پورے کرتی ہے۔ محبوب صدا نے اپنی نئی کتاب کو یہی عنوان یعنی ''تاریخ کا فریب'' دیا ہے مگر اس میں وہ فریب زیرِ بحث آئے ہیں جو لوگ تاریخ کے ذریعے دوسروں کو دیتے ہیں۔ اصل میں یہ صدا کے نو مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ سب مضامین فکر انگیز ہیں اور ہماری قومی حقیقت کو ایک نئے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ بار بار یہ سوال ہمارے سامنے لاتے ہیں کہ آیا پاکستانی اقلیتوں کو اپنا قومی اور انسانی کردار بھرپور انداز میں ادا کرنے کے مواقع دستیاب ہیں؟

محبوب صدا پاکستان مسیحی کمیونٹی کے ترقی پسند دانش وروں میں سرِ فہرست ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پسماندہ معاشروں میں مذہبی اقلیتوں کو دہرا عذاب سہنا پڑتا ہے۔ ان معاشروں میں مذہبی اختلافات کو برداشت کرنے کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے اور معاشی طور پر بھی اقلیتوں کو آگے بڑھنے کی راہ نہیں دی جاتی۔ ہمارے آج کے پاکستان میں اقلیتیں ایک اور عذاب کا شکار بھی ہیں اور یہ عذاب اعجاز الحق کی

صورت میں نازل ہوا ہے۔ مذہبی اور اقلیتی امور کے یہ وفاقی وزیر ہر روز یہ بیان دیتے ہیں کہ اقلیتیں یہاں بڑے سکھ چین کی زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کے ساتھ پورا انصاف ہو رہا ہے اور اُن کے تمام مفادات کا خیال رکھا جا رہا ہے۔

خیر، محبوب صدا اور دوسرے ترقی پسند اقلیتی دانش ور جانتے ہیں کہ اقلیتوں کے مسائل سماج کے دوسرے پس ماندہ طبقوں سے جڑے ہوتے ہیں اور ان سے نجات پانے کے لیے تمام محروم طبقوں کو مل جل کر جدوجہد کرنی ہوگی۔

''تاریخ کا فریب'' میں محبوب صدا نے پاکستانی تاریخ نگاروں، یونیورسٹیوں اور تاریخ و ثقافت سے متعلقہ سرکاری اداروں کی اُن کوتاہیوں کی نشان دہی کی ہے جو وہ تحریک آزادی اور اس ملک کی تعمیر و ترقی میں مسیحیوں کے کردار کے ضمن میں کرتے ہیں۔ خاص طور پر درسی کتب میں اقلیتوں کے کردار کو جس طرح مسخ کیا جاتا ہے، وہ افسوس ناک ہے اور کئی دانش ور اُس کی طرف توجہ دلا چکے ہیں۔ محبوب صدا کا مطالبہ یہ ہے کہ نئے دَور کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ''تاریخی تعصّبات کو دُور کرنے کے لیے تاریخی حقائق کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ اس مقصد کے لیے پاکستان میں پڑھائی جانے والی تاریخ اور تاریخ کے نصاب کا ایک بھرپور جائزہ لیا جائے۔ غیر مسلم پاکستانیوں کے کردار کو اُجاگر کیا جائے تاکہ ایک متوازن اور حقائق پر مبنی تاریخ مرتب ہو سکے اور کسی مخصوص طبقے یا نظریے کی اشاعت کی بجائے پاکستانیت کا فروغ ہو سکے۔''

محبوب صدا نے پاکستان کے تعلیمی نظام کا جائزہ بھی لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو تعلیمی پالیسیاں وقتاً فوقتاً اس ملک میں رائج کی جاتی رہی ہیں وہ تعلیمی نظام کو مفلوج رکھنے اور جہالت کو قائم رکھنے کا وسیلہ رہی ہیں۔ یہ بات قابلِ فہم ہے کیونکہ پالیسیاں حکمران بناتے ہیں اور ہمارے حکمرانوں کو عوام کی تعلیم و تربیت میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ عوام کو جوں کا توں قرونِ وسطیٰ کے ذہنی اور تہذیبی ماحول میں رکھنا چاہتے ہیں۔

''تاریخ کا فریب'' پڑھتے ہوئے آپ بہت سی باتوں سے اتفاق کریں گے اور ممکن ہے کہ کہیں کہیں مصنف سے اختلاف کے پہلو بھی نکل آئیں لیکن مصنف کی ذہنی دیانت داری، خلوص اور جرأت کا اقرار شاید کرنا ہی پڑتا ہے۔

☆☆☆

صائمہ نورین بخاری

نام کتاب : ''آدھا سچ''
مصنف : رضی الدین رضؔی
صفحات : ۱۶۰

قیمت : ۱۲۰ روپے
ناشر : کتاب نگر، ملتان

وہاں کلیاں نہیں کھلتیں وہاں خوشبو نہیں ہوتی
جہاں مقتل نہیں سجتے جہاں زنداں نہیں ہوتے

اس خوب صورت شعر کے خالق رضی الدین رضؔی ہیں۔ دھیمے لہجے اور محبت کی میٹھی کسک کے شاعر، کہنہ مشق صحافی، خوبصورت کتابوں کے مصنف اور ''آدھا سچ'' کہنے والے رضی الدین رضؔی۔ مگر کیا کہیے کہ رضی الدین رضؔی کا ''آدھا سچ'' بہت سے لوگوں کے پورے سچ پر بھاری ہے۔ ان کے ''آدھے سچ'' کے فکاہیہ انداز میں طنز کی تڑپ اور تیکھے پن کی آنچ اس طرح موجود ہے کہ وہ اس آنچ کو بجھاتے بھی نہیں مگر دامن کو داغدار بھی نہیں ہونے دیتے۔ وہ اپنی نثر اور اشعار میں ایک حساس دل لیے مارشل لاء کے تسلسل میں جمہوریت کے متلاشی نظر آتے ہیں اور یہی انداز انہوں نے ''آدھا سچ'' میں بھی اپنائے رکھا۔ بچپن کی محرومیوں نے ان کے اندر کے شگفتہ مزاج انسان کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچائی اور یہی شگفتگی اور شائستگی کا اُسلوب ان کے ''آدھے سچ'' میں نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ آنکھوں کو بھیگنے سے پہلے خشک کرنے کے فن سے آشنا ہیں۔ وہ بات کو بگڑنے سے پہلے سنبھالنے کے ہنر کو بھی جانتے ہیں۔ وہ طنز کو تیر بننے سے پہلے سنبھال لیتے ہیں۔ وہ محبت کو جگنو اور عشق کو خوشبو بننے سے پہلے مٹھی میں بند کر لینے کے قائل ہیں اور زندگی کی اصل حقیقتوں کو پُرنم آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ بیان کرنے کے عادی ہیں۔ وہ قلم کی حرمت و عصمت کا پاس رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں طنز کسی حاسد کے ذہن کی پیداوار محسوس نہیں ہوتی۔ دوستوں کی محبتوں کے درد سے آشنا اور دوستیوں کے احسانات سے مزین، بے تکلفیوں کے رنگ میں گھلی اور طنز کی چبھن میں سلی یہ کتاب درحقیقت ''مضامینِ دوستاں'' ہے اور ہمارے جیسے قلم کار جن کے شعور نے ضیاالحق کے مارشل لاء کی فضا میں آنکھ کھولی کہ جب ادب کا رنگ ''سبز'' اور صحافت کا رنگ ''زرد'' تھا۔ یہ کتاب ہمیں شعور کی ایک اور واضح منزل سے آشنا کرتی ہے۔ رضی الدین رضؔی کہتے ہیں:

> ''بیوروکریسی نے ادب پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد ایک طرف تو جمہوریت پسند ادیبوں کا ناطقہ بند کیا۔۔۔ اور دوسری طرف ایسے غیر ادیبوں کو متعارف کرایا جنہیں عام حالات میں شاید کبھی بھی ادب میں کوئی مقام حاصل نہ ہوتا۔ یہ سب مارشل لاء دَور کی مہربانیاں ہیں۔ ادیب اور شاعر چھوٹے چھوٹے مفادات میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔'' (نیاز لکھویرا، عہدِ ضیاع کی باتیں)

اور اس امر کی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رضی الدین رضؔی سمیت جنوبی پنجاب کے دیگر محنتی تخلیق کاروں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے جنوبی پنجاب کے گرد گداگر گرما والے اس شہر میں جنم لیا جہاں اُردو بول چال اور طرزِ تحریر کے وصف کو کسی سائبان بلکہ ایک قدآور گروپ کی ضرورت تھی مگر افسوس

یہاں کی روکھی پھیکی فضا نے بہترین ادیبوں کی نقل مکانی کے چلن کو فروغ دیا اور ان مقامی ادیبوں کو وہ سائبان نہ مل سکا جس کے وہ متلاشی تھے اور محنتوں کو وہ مقام نہ مل سکا جن کے وہ حق دار ہیں۔ بڑے تردّد کے بعد پی ٹی وی کے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں ہمارے خطے کے ان قلم کاروں کو اگر بلایا بھی گیا تو ان کی نگارشات "Break" کی نذر کر دی گئیں۔ خیر موضوع کی طرف آتے ہیں یہ تو وہ دیپک راگ ہے جو جلنے اور سلگنے کے عمل کو اور ہوا دیتا ہے۔ ''راکھ''، ''ازلی اور اصلی دشمنوں کی کہانی''، ''عباس برمانی کی کیلاش کہانی'' میں ان کا شگفتہ اُسلوب لطیف اور نہایت متاثر کن ہے۔

''جاوید چودھری۔ اچھا کالم نگار یا مقبول کالم نگار'' ان کا وہ بہترین مضمون جس کے ذریعے انہوں نے قلم کا حق ادا کیا۔ ''فانوس بن کے جس کی حفاظت چچا کرے'' شاکر حسین شاکر کے لیے لکھا جانے والا وہ دلچسپ مضمون ہے جو قاری کو مسکراہٹوں سے آگے قہقہوں کی دل کشا وادی میں لے جاتا ہے۔ اب معلوم نہیں شاکر صاحب سے شادی (بصورت شاکرہ) ان کو کتنا فیض دیتی کیونکہ جس قسم کے مزاجی تضادات دونوں فریقین میں پائے جاتے ہیں۔ اتنے تو چارلس اور ڈیانا میں بھی نہیں پائے جاتے تھے اور اتنی سوشل بیگم رضی صاحب کیسے برداشت کرتے کیونکہ شاکر صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ شاکر صاحب کو ان کا بھی پتہ ہے جنہیں خود اپنا بھی پتہ نہیں اور رضی صاحب کو ان کا بھی نہیں پتہ جن کا تقریباً سب کو پتہ ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ وگرنہ خدا معلوم یہ ''شری شادی'' کیا کیا ''شرارے'' جنم دیتی۔

خیر اب ہم آتے ہیں کتاب کے بہترین مضمون کی جانب۔ ''آہ رضی الدین رضیؔ'' ایک منفرد قسم کا انشائیہ نما کالم، ایک تلخ سی حقیقت مگر مسکراہٹوں سے بھرپور، ایک چبھتا ہوا احساسِ محرومی لیے، پُرنم آنکھوں کے ساتھ قہقہے لگانے پر مجبور کر دینے والا کالم، ایک شاعر کے اقتصادی و سماجی حالات کی کہانی، ایک جینوئن قلم کار کا فسانہ، ایک سنسان سڑک پر چلنے والے معصوم سے لڑکے کی حالتِ زار۔ اپنے بارے میں کیا خوب کہتے ہیں کہ ''اور بہت سے دکھوں میں سے ایک دکھ جو انہیں دیمک کی طرح چاٹ گیا تھا کہ انہیں مرتے دم تک کوئی سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔'' بہرحال ہم رضی صاحب کو اتنا ضرور سمجھ سکے ہیں کہ وہ ایک نرم دل حساس شاعر اور قلم پر بھرپور گرفت رکھنے والے نثر نگار ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ محبت اور دوستی کا اختتامیہ کبھی تحریر نہیں کیا جاتا اور یہ محبت اور دوستی جس کا اظہار انہوں نے ''آدھے سچ'' کی بدولت اپنے قارئین سے کیا ہے اس کا اختتامیہ بھی کبھی تحریر نہیں ہوگا۔

☆☆☆

ڈاکٹر خالد سنجرانی

شہر، چوراہے اور سڑکیں

لکشمی چوک:

سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے ایک نوجوان نے لکشمی چوک پر جھاڑو دینے والے سے پوچھا۔ ''مولانا ظفر علی خاں چوک کدھر ہے؟'' جھاڑو دینے والے سے مایوس ہو کر وہ ایک رکشہ والے کے پاس گیا۔ رکشے والا اسے گھما پھرا کر واپس ریلوے اسٹیشن لے گیا۔ وہاں اس نے انٹرویو کال لیٹر نکال کر کئی لوگوں کو دکھایا کہ اس پر پتہ ظفر علی خاں چوک کا درج تھا۔ کوئی بھی اس کی رہنمائی نہ کر سکا۔ رکشے والا اسے ایک ویگن والے کے پاس لے گیا۔ ویگن میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے آدمی نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا: ''اس بدبخت کو لکشمی چوک لے جاؤ۔'' اس نوجوان کو رکشہ والا لکشمی چوک واپس لے آیا۔ رکشہ ڈرائیور نے کہا: ''باؤ جی، معاف کرنا مجھے بھی پتہ نہیں تھا کہ اس چوک کا سرکاری نام بھی ہے۔'' نوجوان کچھ وہمی تھا، کچھ بے روزگاری کے ہاتھوں اُکتایا ہوا اور کچھ بدگمان۔ کہنے لگا: ''یہاں کسی بھی بورڈ پر ''مولانا ظفر علی خاں چوک'' درج نہیں۔ تم نے دھوکا کیا ہے۔ اپنے پیسے بنائے ہیں۔ میرے مستقبل سے کھیلا ہے۔'' اس شور کی وجہ سے آس پاس کے چند دوکان دار اکٹھے ہو گئے۔ نوجوان مسلسل جھگڑے جا رہا تھا۔ چھوٹے سے مجمع میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور کہنے لگا: ''آپ دونوں سچے ہیں۔ وہ سامنے ریڑھیوں کے پیچھے ''مولانا ظفر علی خاں چوک'' کا سرکاری بورڈ لگا ہے لیکن اس پر اشتہار اتنے چسپاں ہیں کہ نظر نہیں آتا۔ آپ جا کر تسلی کر لیں۔'' اپنے مطلوبہ مقام پر جب وہ نوجوان پہنچا تو ابھی انٹرویو شروع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اس نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا: ''شکر ہے ریل گاڑی لیٹ نہیں ہوئی، ورنہ مارے جاتے۔''

جین مندر چوک:

بھارت میں بابری مسجد کی شہادت پر سب سے بڑا ردِعمل لاہور میں ظاہر ہوا۔ پرانے مندروں کی عمارتیں جو اَب پرائمری سکولوں اور ہیلتھ سنٹروں کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں، گرا دی گئیں۔ لوگوں نے لاہور میونسپل کے بلڈوزروں پر چڑھ کر فتح کے نعرے بلند کیے اور لال قلعہ پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کے عزم کا اعادہ کیا۔ پرانی انارکلی کے قریب جین مندر کی عمارت میں ایک پرائمری سکول قائم تھا، اسے گرا دیا گیا۔ لوگوں نے کہیں سے برش اور پینٹ کا ڈبہ پکڑا اور سکول کی بیرونی دیوار پر جلی حروف میں

لکھا: ''بابری چوک۔''

دو دن بعد ان حالات سے بے خبر سرحد کے قریب واقع قصبہ مناواں کا ایک دیہاتی ریلوے اسٹیشن سے ۹ نمبر ویگن پر سوار ہوا۔ کنڈیکٹر کو کرایہ دیتے ہوئے اس نے کہا: ''جین مندر چوک'' کنڈیکٹر نے گھبرا کر سواریوں کی طرف دیکھا اور بولا: ''بابے او بابری چوک، بابری چوک۔'' دیہاتی نے قدرے پریشان ہو کر کہا: ''نہ میرا بچہ، میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں۔ بیمار بھی رہتا ہوں۔ دھکے نہ دلوانا۔ جین مندر چوک پر میرا بچہ۔ جین مندر چوک پر۔ پرانی انارکلی کے پاس۔ کنڈیکٹر سمجھ دار تھا صورتِ حال بھانپ کر بولا ''ارمان نال بیٹھو، اتار دوں گا۔'' بزرگ دیہاتی دعائیں دینے لگا: ''جیوندا رہ، لمبی عمر ہووی۔'' ویگن کی کچھ سواریوں نے دیہاتی سے تو کچھ نہ کہا آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ ایک مسافر سے رہا نہ گیا، بلند آواز میں کنڈیکٹر سے کہنے لگا: ''دیدوں کا پانی مر گیا ہے ہم سب کا، غیرت تو رہی نہیں، اُدھر اتنا کچھ ہو گیا اور ہم ابھی تک۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔'' ویگن اسٹیشن سے روانہ ہو چکی تھی۔ ملّی غیرت کے فقدان پر باتیں ہونے لگیں۔ دیہاتی حیرت سے سب کا منہ تکتا رہا۔ ویگن جب جین مندر چوک پہنچی تو کنڈیکٹر نے کڑک دار آواز لگائی: ''بابری چوک بھئی، بابری چوک۔'' اس پر کئی چہروں پر اطمینان کے آثار ظاہر ہوئے۔ کنڈیکٹر نے دیہاتی کو وہاں اُتار دیا۔ دیہاتی پرانی انارکلی میں اپنی گجر برادری سے مل کر جب واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگا تو اس کے ایک ہم عمر عزیز نے سمجھایا: ''دیکھو، یہاں آج کل حالات بڑے خطرناک ہیں۔ آئندہ بابری چوک کہنا۔ سمجھ گئے نا!'' دیہاتی نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ گیا، سمجھ گیا۔''

دو ماہ بعد اس دیہاتی کو پھر سے ایک فوتیدگی کے سلسلے میں لاہور آنا تھا۔ اس نے اس مرتبہ بڑی احتیاط سے کام لینے کا سوچا۔ ۹ نمبر ویگن میں کرایہ دیتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا: ''پُتر! بابری چوک، بابری چوک۔'' ویگن میں موجود ہر شخص نے پلٹ کر اس بزرگ کی طرف دیکھا۔ کنڈیکٹر نوعمر تھا اور اس روٹ پر چلتے ہوئے اسے ابھی صرف ایک ہی دن گزرا تھا۔ اس نے پیسے لیتے ہوئے حیرانی سے کہا: ''بابری چوک!'' چند سیکنڈ کے توقف کے بعد جوشیلے انداز میں بولا: ''اچھا، اچھا، جین مندر چوک۔'' ویگن میں بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص نے رشک کی نگاہ سے سہمے ہوئے بزرگ دیہاتی کو دیکھا اور کہا: ''پرانی نسل پرانی نسل ہے۔ خدا کی قسم جواب نہیں اس نسل کا اور ایک یہ نئی نسل ہے ___ توبہ توبہ۔''

ویگن سے اُتر کر دیہاتی حیرانی کے عالم میں جین مندر چوک پر کچھ دیر کھڑا رہا۔ اس دوران میں پانچ چھ ویگنیں گزریں۔ ہر ویگن سے ایک ہی صدا آتی تھی: ''جین مندر چوک ہے کوئی، جین مندر چوک۔'' دیہاتی ہاتھ ہلاتا ہوا چل دیا: ''ربّا! تیریاں توں ہی جانے۔''

منٹگمری:

بہار کے موسم میں ایک جاپانی جوڑا ہڑپہ جانے کے لیے ٹورازم کی بس سے ساہی وال پہنچا۔

ڈرائیور نے بس روکتے ہوئے کنڈیکٹر سے کہا: 'اوئے! دو باندر یہاں اترنے ہیں، دھیان سے۔ بڑے صاحب کا حکم ہے۔'' کنڈیکٹر ہنستا ہوا دونوں کی سیٹوں کے قریب پہنچا اور کہا: ''اِٹ از ساہی وال۔ کم اینڈ دِس از ساہی وال۔ ایہ تھیلے مینوں پھڑاؤ۔'' جوڑے نے حیران کن انداز میں یک زبان ہو کر کہا: ''ساہی وال!'' انہوں نے نقشہ نکالا۔ اس میں منٹگمری پر ہاتھ رکھتے ہوئے چلا کر کہا: ''منٹگمری، منٹگمری، ہڑپہ، ہڑپہ۔'' اُردو تو بہت دُور کی بات ہے، ان دونوں کو انگریزی بھی نہیں آتی تھی۔ وہ سیدھا ڈرائیور کی طرف بڑھے اور طیش میں آ کر زور زور سے ہاتھ مار کر چلانے لگے۔ ''منٹگمری، منٹگمری'' اور ''ساہی وال، ساہی وال'' کو بگڑے ہوئے لہجے میں ادا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے انکار میں ہاتھ ہلانے لگے۔ ڈرائیور کچھ حد تک انگریزی جانتا تھا۔ اس نے بہتیری کوشش کی وہ انہیں کچھ سمجھا سکے لیکن بس ''منٹگمری، منٹگمری'' کے الفاظ سے بھری جا رہی تھی۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ انہیں ساہی وال نامی کسی جگہ پر اُتارا جا رہا ہے اور اس جگہ کا نام و نشان تک ان کے پاس موجود نقشے میں نہیں۔ جوڑے کا غصہ دیدنی تھا جو لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جاپانی لڑکا کبھی اپنا بیگ بس کے فرش پر پٹختا، کبھی پاؤں مارتا اور کبھی اپنا ماتھا تھام کر کہتا ''منٹگمری۔'' بس کی سواریاں اس ہنگامے کے شروع سے پہلے ہی اُتر کر جا چکی تھیں اور ہوٹل میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں، اس لیے کوئی بھی ڈرائیور کی مدد کو نہ آ سکا۔ ڈرائیور انہیں ہوٹل منیجر کے پاس لے گیا۔ اس نے بڑے تحمل سے اشاروں میں انہیں سمجھایا کہ ہڑپہ نزدیک ہے۔ آپ لوگ ہمارے ہوٹل کی گاڑی پر ہڑپہ جائیں گے جو صرف بیس منٹ کی مسافت پر ہے۔ منیجر نے ساہی وال اور منٹگمری کا جھگڑا ہی نکال دیا اور انہیں ہڑپہ روانہ کر دیا۔ بس کنڈیکٹر ذات کا ساہی تھا۔ دھواں چھوڑتی ہوئی ہوٹل کی گاڑی کو جاتے دیکھ کر بولا: ''یہ تمہارے باپ منٹگمری نہیں۔ یہ اب ساہی وال ہے، ساہی وال۔''

☆☆☆

سیّد تحسین گیلانی

کس طرح....!

کبھی یہ سانس چلتی ہے تو لگتا ہے کہ آری ہے
ابھی تو خواہشیں ذہنوں کی دلدل میں کہیں
غرقاب ہیں___ دیکھو
ابھی تو اِس فضا کی خوشبوؤں میں بھی ملاوٹ ہے
ابھی تو رات کا چہرہ گھناؤنا ہے
زبانوں میں ہیں اتنے چھید کہ
اِس رہ گذر سے گفتگو کی فوج گزرے بھی تو
وہ لشکر___ ضمیر اپنا انہیں چھیدوں میں رکھ کر بھول آتا ہے
یہاں تو زندگی مخدوش ہے اور جسم کانٹوں سے اٹے ہیں اب
یہاں تو الجھنوں کے طوق ہیں سارے گلوں کو جھولنا دیتے ہوئے___ دیکھو
یہاں پر رقص بھی تو رِند کی بانہوں میں نہ جھولے تو اُس کی سانس رُکتی ہے
یہاں تو ساز بھی، سُر بھی یہاں کاغذ کی برکھا میں ہیں بھیگے یوں
کہ نہ دیپک میں ہے جادو نہ ہے ملہار میں رِم جھِم
یہاں پر ''کار'' تو ہے ہی نہیں___ دیکھو
ہے بس ''بے کار'' کی رِم جھِم
یہاں نغمہ بھی دیکھو بے صدا ہے
لفظ بھی جب گنگ ہوں تو
نغمگی کیسے پلے
کیسے بھلا گیتوں میں ہو وہ درد
اور وہ زندگی کی جل ترنگ
کیسے یہاں ہو طرفگی
کیسے ملائک اس زمیں پر رحمتیں لے کر پدھاریں
کہ جہاں من کی پلیدی باس مارے
اُس زمیں پر رحمتیں لے کر فرشتے
ایک پل بھی کس طرح یارو گزاریں
کس طرح___ مجھ کو بتاؤ
کس طرح.....!

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

''مجھے کون بلاتا رہتا ہے''

''مرے پاؤں کے نیچے خاک نہیں
کسی اور زمیں کی مٹی ہے''
مرے ہاتھ میں وقت کی راسیں ہیں
جو پل پل پھسلی جاتی ہیں
اور ہرے درختوں کی شاخیں
مرا رستہ جھانکتی رہتی ہیں
اور سبز گھنیرا جنگل ہے

مرے پاؤں کے نیچے چاند نہیں
اک اور ہی دیس کی مٹی ہے
اور دھوپ کا دریا موج میں ہے
اور دشت مرے قدموں سے لپٹا جاتا ہے
مجھے کوئی ناں کوئی بلاتا ہے

مرے پاؤں کے نیچے پاؤں نہیں
مرا جسم نہیں مری جان نہیں
مری آنکھوں نے کی ہے غداری
مرے ہاتھ کسی نے کاٹ دیئے
مرا دل مجھے راہ میں چھوڑ گیا
اب دھوپ کا دریا موج میں ہے
اور دُور کوئی
جنگل میں ہے
جو ہر پل مجھے بلاتا ہے

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

گرتا ہوا آسماں

فصلِ شام سے آگے
ہوئے منسوخ سب رستے
یہاں حرف و ہُنر کوئی معانی ہی نہیں رکھتے
سماعت گاہ ویراں ہے
نظر تختِ سبا کی منتظر ہے
کہانی آخری کردار سے آگے
جہاں منسوخ رستے ہیں
فصیلِ شام ہے یعنی
زمیں پر ٹوٹ کر گرتا ہوا اک آسماں ہے
لہو کی لہر ہے لیکن یہ دریا خامشی سے بہہ رہا ہے
زمیں کروٹ بدلنے کے لیے تیار ہے
اور قیامت چل پڑی ہے
یہ ہمارے درس گاہِ وقت میں جانے کے لمحے ہیں
کہ ہم بستے اُٹھائے
اپنے در پر ہی کھڑے ہیں
اور فصیلِ شام پر رستے خط تنسیخ سے آگے نکلتے ہیں

☆☆☆

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

جولائی ۲۰۰۶ء کا شمارہ موصول ہوا۔ محترمہ ڈاکٹر شگفتہ حسین صاحبہ کا خط پڑھا۔ خط کی جذباتی فضا اور غیر معقولیت نے جواب لکھنے پر مجبور کیا لیکن لکھنے سے پہلے یہ خیال مانع ہوا کہ ڈاکٹر صاحبہ نے چونکہ جس تحریر پر تنقید کی ہے وہ راقم کی ہے لہٰذا جواب دیتے ہوئے کہیں اس میں اپنی ذات یوں ملوث نہ ہو جائے کہ عناد و فساد کی بُو آنے لگے اور لہجہ کہیں غیر علمی روش اختیار نہ کر جائے کیونکہ اگر ڈاکٹر صاحبہ ''ادبِ لطیف'' کی محبت اور طرف داری میں اس قدر جذباتی اور تلخ نوائی کی مرتکب ہو سکتی ہیں تو یہاں معاملہ اپنی ذات کا آن پڑتا ہے اور اس معاملے میں تو بڑے بڑے ڈگمگاتے دیکھے گئے ہیں لہٰذا میں کیا اور میری بساط کیا؟

لیکن جلد ہی یہ خیال آیا کہ معاملہ صرف اور صرف میری ذات کا ہی نہیں بلکہ ایسے علمی، ادبی اور تحقیقی رویوں کے ملوث ہونے کا بھی ہے جو غیر مستحسن ہیں۔ لہٰذا ان غیر مستحسن رویوں کا ذکر اذکار اور سدِ باب کرنے کی کوششوں میں اگر تھوڑی بہت ذات ملوث ہو بھی جائے تو شاید زیادہ بُرا نہیں۔

مثلاً تحقیق میں سب سے زیادہ غیر مستحسن رویہ تو یہی ہے کہ جس موضوع یا شخصیت پر ہم ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لیتے ہیں وہ شخصیت یا موضوع ہمارے لیے ممدوح کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ ہم پوری زندگی اُس کا دفاع کرنے اور عظمت کے گُن گانے میں صرف کر دیتے ہیں اور اس موضوع سے باہر نہیں نکل پاتے۔ سپیشلائزیشن کی یہی سب سے بڑی خرابی ہے یا شاید ہم نے پیدا کر لی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ پی ایچ ڈی اسکالرز دیگر موضوعات اور علوم کی اہمیت کا بھی نہ صرف ادراک کریں بلکہ اُن سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کو تقویت پہنچائیں اور اپنے تحقیقی موضوع پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے کی جرأت بھی پیدا کریں لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے۔ ہم اُسی ایک موضوع تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ موضوع ہمارا ممدوح بن جاتا ہے اور یوں جو سب سے بڑا نقص ہم میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ ہم ہر معاملہ کو اپنی اسی ایک عینک ہی سے دیکھنے لگتے ہیں اور اس حد تک کہ بعض اوقات ہم مفاہیم اور نتائج تک غلط اخذ کر جاتے ہیں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ محترمہ ڈاکٹر شگفتہ حسین صاحبہ کے ساتھ پیش آیا جنہوں نے راقم پر ''ادبِ لطیف'' کی محبت میں تابڑ توڑ تنقیدی حملے تو کر دیئے لیکن اصل تحقیقی موقف یا جہت کو سمجھے بغیر۔ اعتراض تنقید پر نہیں کہ یہ اُن کا بنیادی حق ہے۔ اعتراض راقم کے اصل موقف کو نہ سمجھنے اور بے بنیاد الزامات عائد کرنے پر ہے۔ میرے جس موقف کو ڈاکٹر صاحبہ سمجھ نہ پائیں اور جس کی وجہ سے رائی کا پہاڑ بن گیا وہ محض اتنا

تھا کہ ''پھوجا حرام دا'' منٹو کا افسانہ ہے یا نہیں؟ میری تحقیق کا مطمع نظر یہ قطعاً نہیں تھا اور نہ ہے کہ ''پھوجا حرام دا'' پہلے پہل کس جریدہ میں شائع ہوا۔ ''انگارے'' کے فروری ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں، میں نے یہ استفسار کیا کہ ''پھوجا حرام دا'' منٹو کا افسانہ ہے یا نہیں؟ اور جون ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں ''پھوجا حرام دا'' کو منٹو کا افسانہ ثابت کرنے کے لیے خارجی شہادت کے طور پر ''ساقی'' کے جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء کی سند مہیا کی جس میں یہ افسانہ شائع ہوا اور داخلی شہادت کے لیے افسانے کا تجزیاتی سا مطالعہ پیش کیا۔ اب اگر یہ شواہد ملتے ہیں کہ یہ افسانہ ''ساقی'' کے مذکورہ شمارہ کے علاوہ دیگر رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوا تو اس سے میرے موقف کو تقویت ملتی ہے، اُس کی تردید نہیں ہوتی۔

یعنی یہ بات صاف ہوئی کہ میرا سوال یہ تھا کہ ''پھوجا حرام دا'' منٹو کا افسانہ ہے یا نہیں؟ اور ڈاکٹر صاحبہ کی طرف سے جواب آیا کہ ''پھوجا حرام دا'' پہلی بار ''ادبِ لطیف'' میں اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ تو یہ جواب، سوال سے کچھ relevant نہیں لہٰذا جچا بھی نہیں۔ یہاں میں پھر یہ توجہ دلا دوں کہ پہلے پہل میں نے یہ سوال فروری ۲۰۰۶ء کے ''انگارے'' میں اُٹھایا تھا۔ حیرت اس بات کی ہے کہ اُس وقت ڈاکٹر صاحبہ نے اس بات کی تصدیق نہیں فرمائی۔ اصولاً مارچ کے ''انگارے'' میں ڈاکٹر صاحبہ کا خط آنا چاہیے تھا کہ جی یہ افسانہ منٹو کا ہی ہے اور ادبِ لطیف میں شائع ہوا تھا مگر اُس وقت وہ خاموش رہیں۔ مجھے پروفیسر محمد سعید صاحب سے اس کا جواب ملا۔ انہوں نے اپنے ذاتی خط میں میری راہنمائی فرمائی اور ''ساقی'' کے مذکورہ شمارہ کی نشان دہی کی اور میری فرمائش پر ثبوت بھی مہیا کیے۔ مجھے اپنے موقف کے لیے یہ ایک ثبوت بھی کافی تھا کیونکہ میں نے ''پھوجا حرام دا'' کہاں کہاں اور کب کب شائع ہوا، کا اشاریہ مرتب نہیں کرنا تھا اور نہ یہ میرا مقصود تھا۔ میں تو یہ چاہ رہا تھا کہ میرے پاس جو منٹو کے افسانوں کی مرتبہ کتاب ہے جس میں ''پھوجا حرام دا'' موجود ہے اور جو میرے نزدیک معتبر سند نہیں، اس کے علاوہ کوئی ایک معتبر سند ضرور ایسی مل جائے جسے جھٹلایا نہ جا سکے، تو وہ مجھے مل گئی اور میں نے اپنے موقف کو پیش کر دیا۔ اس اُمید پر کہ اب باقی لوگ مزید رسائل و جرائد کی نشان دہی کر کے، جہاں جہاں یہ افسانہ شائع ہوا ہے، میرے موقف کی تائید کریں گے اور خود بہ خود یہ بات سامنے آجائے گی کہ کتنی بار اور کہاں کہاں اور کب کب یہ افسانہ شائع ہوا۔ یوں ہم سب مشترکہ طور پر یہ بات ثابت کریں گے کہ ''پھوجا حرام دا'' منٹو کا افسانہ ہے اور یہاں میں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ میرے لیے ساقی اور ادبِ لطیف اپنی ادبی خدمات کے حوالے سے ایک سی ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا میرے لیے ساقی کی سند بھی اتنی ہی معتبر ہے جس قدر ادبِ لطیف کی۔

لیکن ڈاکٹر صاحبہ جو فروری ۲۰۰۶ء کے انگارے میں کیے گئے استفسار کے جواب میں تو خاموش رہیں اور میرے خیال سے علم کو چھپانے کے جرم کی مرتکب ہوئیں، اچانک صرف اس بات پر کہ ''پھوجا حرام دا'' ساقی کے ۱۹۵۵ء کے جوبلی نمبر میں شائع ہوا، برانگیختہ و برافروختہ ہو گئیں اور ادبِ لطیف

کی اولیت ثابت کرنے لگیں۔ یعنی انہیں میرے استفسار سے تو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ''پھوجا حرام دا'' منٹو کا افسانہ ہے یا نہیں، انہیں اس سے غرض نہیں لیکن ادبِ لطیف کی شان میں گستاخی (یعنی اُس کو اولیت کا تاج نہ پہنانا) اُن سے برداشت نہ ہو سکی حالاں کہ غور کیا جائے تو ادبِ لطیف کے بارے میں راقم کسی طرح کی گستاخی کا مرتکب نہیں ہوا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو فیضؔ صاحب یہ کیوں فرماتے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

لہٰذا اپنی برانگیختگی و برافروختگی کے تحت ڈاکٹر صاحبہ نہ صرف بے بنیاد تنقیدی آرا دیتی چلی گئیں بلکہ مجھ پر بے بنیاد الزامات بھی عائد کرتی چلی گئیں اور کچھ بے سروپا باتیں بھی ادبِ لطیف کی محبت میں اُن کے قلم سے نکلتی گئیں۔

سب سے پہلے، الزام کی طرف آیئے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے ادبِ لطیف کا وہ شمارہ جس میں ''پھوجا حرام دا'' شائع ہوا تھا، پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں دیکھا اور پڑھا تھا اور اب جب دوبارہ وہاں یہ پرچہ دیکھنا چاہا تو وہ غائب تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحبہ راقم پر اس چوری کا الزام ان الفاظ میں عائد کرتی ہیں کہ ''۔۔۔ میں نے پبلک لائبریری، لاہور سے یہ پرچہ دوبارہ دیکھنا چاہا تو معلوم ہوا کہ منٹو کے کسی شیدائی نے شاید اس فراموش شدہ افسانے کی خاطر یہ پرچہ ہی لائبریری سے غائب کر دیا ہے۔''

اس الزام کے بارے میں دو باتیں عرض ہیں۔ پہلی بات یہ کہ بالفرض اگر میں وہاں سے یہ پرچہ غائب کرتا ہوں تو بتایا یہ جائے کہ اپنے کس موقف کی تسکین کے لیے کیونکہ میرا موقف یہ ثابت کرنا تو ہے ہی نہیں کہ یہ افسانہ پہلی بار ساقی میں شائع ہوا۔ آپ میرا مضمون اُٹھا کر دیکھ لیں کہیں یہ دعویٰ نہیں ملے گا کہ ''پہلی بار'' یہ افسانہ ساقی میں شائع ہوا۔ پھر آخر مذکورہ شمارہ غائب کر کے کس موقف کی تائید حاصل کرنا مقصود تھی۔ مجھے تو ادبِ لطیف کا حوالہ دے کر اپنا موقف اور مضبوط بنانا چاہیے تھا۔ خیر دوسری بات یہ کہ اگر ڈاکٹر صاحبہ کو مذکورہ شمارہ پبلک لائبریری میں نہیں مل سکا تو میں انہیں بتلائے دیتا ہوں کہ انہیں یہ شمارہ کہاں مل سکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اتنا عرض کروں گا کہ ایک ریسرچ اسکالر کو ایک ہی لائبریری تک محدود ہو کر نہیں رہ جانا چاہیے۔ کم سے کم اُسے ایک شہر کی لائبریریوں کی پوری خبر تو ضرور ہونی ہی چاہیے۔ تو جناب ادبِ لطیف کا مذکورہ شمارہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور کی لائبریری میں بھی موجود ہے بلکہ پورا فائل موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ سے گزارش ہے کہ فوری طور پر وہاں سے تصدیق فرمالیں وگرنہ دوسری صورت میں تیسری جگہ کی نشان دہی میرا فرض نہیں ہوگا۔

اب میں ڈاکٹر صاحبہ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ عامر سہیل صاحب کو مضمون بھیجتے ہی یہ اطلاع بذریعہ پروفیسر محمد سعید صاحب مل گئی تھی کہ ادبِ لطیف کے اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں بھی یہ افسانہ شائع ہوا ہے لیکن میرے سامنے بطور محقق یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا میں اس ثبوت کو اپنے مضمون میں شامل کروں جسے میں

نے ابھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا یار ہنے دوں؟ کیونکہ ساقی کے ذریعے مجھے اپنے موقف کی سند تو مل ہی گئی تھی۔ مگر پھر سوچا کہ حواشی میں یوں اضافہ کردوں کہ ''یہ افسانہ بقول پروفیسر سعید صاحب ادبِ لطیف کے اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں بھی شائع ہوا لیکن راقم نے ابھی اپنی آنکھوں سے اسے نہیں دیکھا۔'' اور اس مقصد کے لیے میں نے عامر سہیل صاحب کو فون کیا کہ وہ ایسے اضافہ فرمادیں لیکن انگارے شاید کمپوزنگ کے مراحل سے گزر گیا تھا اور جب عامر سہیل صاحب نے یہ فرمایا کہ کوئی بات نہیں ڈاکٹر شگفتہ حسین صاحبہ نے ادبِ لطیف پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اور اُن کے پاس اس کا پورا فائل موجود ہے لہٰذا وہاں سے دیکھ لیں گے تو مجھے حواشی کو بڑھانے پر اصرار نہ رہا۔ میں نے سوچا کہ مضمون شائع ہونے پر ڈاکٹر صاحبہ اس کا ثبوت فراہم کردیں گی اور میرے موقف کو مضبوط بنادیں گی کہ مجھے تو محض تصدیق سے غرض تھی لیکن اس بات کی مجھے قطعاً اُمید نہ تھی کہ وہ اصل موقف کو ہی نہ سمجھ پائیں گی۔

بہرحال آگے چلتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ لکھتی ہیں کہ ''یہ منٹو کا فراموش شدہ افسانہ تو قطعی نہیں ہے۔ یوں محققین سے کبھی کبھی چوک ہوجاتی ہے۔'' میں ابھی اس بیان کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آگے لکھا ہوا نظر آیا کہ ''فیاض صاحب نے اپنے مضمون کا آغاز اس بات سے کیا ہے کہ کسی محقق نے اس افسانے کا حوالہ نہیں دیا تو صاحب میں نے اپنے مقالے میں حوالہ دیا ہے۔'' یہ پڑھ کر مجھے اصل بات سمجھ آگئی کہ ڈاکٹر صاحبہ کو اصل غصہ اس بات پر ہے کہ میں نے اُن کا مقالہ کیوں نہیں پڑھا۔ خیر اُن کا غصہ اپنی جگہ پر لیکن اس معاملے میں بھی وہ مجھے قصوروار نہیں ٹھہرا سکتیں کیونکہ اگر وہ غور سے میرا مضمون دیکھیں تو جہاں میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''پھوجا حرام دا'' وہ افسانہ ہے جسے ہمارے ناقدین اور محققین نے قطعی طور پر نظر انداز کیا ہے، وہاں میں نے واوین میں صاف صاف لکھا ہے کہ ''میرے اب تک کے محدود مطالعے کے مطابق'' اور یہ محدود مطالعہ اسی لیے ہے کہ میں نے منٹو کے حوالے سے ابھی صرف اور صرف وارث علوی، علی ثنا بخاری، انوار احمد، انیس ناگی، محمد محسن، جگدیش چندر ودھاون، ممتاز شیریں، حسن عسکری، فتح محمد ملک، وزیر آغا، سجاد حارث، ممتاز حسین، وقار عظیم، عبادت بریلوی جیسے صاحبانِ علم کی تحاریر ہی دیکھی ہیں، ابھی ڈاکٹر شگفتہ صاحبہ کا مقالہ نہیں پڑھا۔ اُن کا مقالہ پڑھ کر واقعی میرے علم میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ ''پھوجا حرام دا'' کہلائے گا پھر بھی فراموش شدہ افسانہ ہی کیونکہ بات ہوتی ہے عمومی رویے کی۔

اب آتا ہوں میں اپنے مضمون کے اُس حصے کی طرف جہاں مجھ سے واقعی تحقیقی غلطی ہوئی مگر یہاں بھی بجائے اس کے کہ ڈاکٹر صاحبہ میری غلطی بھانپتیں، انہوں نے ادبِ لطیف کی اولیت اور اہمیت کے گُن گانے شروع کردیئے۔ میں نے لکھا تھا ''ساقی کے مالک اور ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی تھے۔ منٹو کے افسانے ''دھواں'' اور ''کالی شلوار'' بھی ساقی ہی میں شائع ہوئے تھے اور جب ان افسانوں پر مقدمہ چلایا گیا تو شاہد احمد دہلوی پر ان افسانوں کو شائع کرنے کی فردِ جرم عائد کی گئی۔ لہٰذا منٹو کے ساتھ ساتھ انہیں

بھی دھر لیا گیا تھا۔'' ڈاکٹر شگفتہ صاحبہ اس پر یوں معترض ہوئیں کہ ''ممکن ہے دھواں ساقی میں شائع ہوا ہو اور اس پر مدیر ساقی کو مقدمے کا سامنا بھی کرنا پڑا ہو لیکن مقدمات کی زد میں آنے والے منٹو کے معروف افسانے ''کالی شلوار'' اور ''بُو'' ادبِ لطیف میں شائع ہوئے تھے۔'' اور پھر اس کے بعد ادبِ لطیف کی اولیت و اہمیت کی رام کہانی شروع ہوگئی جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے سوائے ادبِ لطیف کے کسی اور رسالے کے حوالے سے منٹو پر کبھی مقدمہ نہیں ہوا۔ تو جناب ایسا بالکل نہیں ہے۔ یہ تو بہرحال درست ہے کہ ''دھواں'' اور ''کالی شلوار'' کے سلسلے میں منٹو اور شاہد احمد دہلوی پر مقدمہ ہوا تھا اس میں کوئی شک نہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحبہ کو یہ علم نہیں تو اَب یہ جان لینا چاہیے بلکہ ایک بار تو ''جاوید'' کے ایڈیٹر عارف عبدالمتین پر بھی منٹو کے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' کو شائع کرنے پر مقدمہ ہوا تھا اور ''ٹھنڈا گوشت'' پہلی بار ''جاوید'' ہی میں شائع ہوا یہ اعزاز ادبِ لطیف کو حاصل نہ ہوسکا۔ اسی طرح نقوش میں ''کھول دو'' پہلی بار شائع ہوا تو اس پر اگرچہ مقدمہ تو نہ ہوا لیکن وہ چھ ماہ کے لیے بند کردیا گیا۔ تو یہ طے ہے کہ ایسے اعزازات ادبِ لطیف کے ایڈیٹروں کے علاوہ دوسری شخصیات اور رسائل کو بھی حاصل ہوئے۔

مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے مکمل وضاحت پیش نہیں کی۔ اصل میں شاہد احمد دہلوی ''ساقی'' کے نام سے ادبی رسالہ بھی شائع کرتے تھے اور ساتھ ہی ''ساقی بک ڈپو'' کے نام سے اشاعتی ادارے کے بھی مالک تھے۔ یہ مقدمہ جس کا میں نے ذکر کیا، اصل میں منٹو کے اُس افسانوی مجموعہ کے دو افسانوں ''دھواں'' اور ''کالی شلوار'' پر دائر ہوا تھا جو ساقی بک ڈپو سے ''دھواں'' ہی کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ ''کالی شلوار'' پر یہ دوسرا مقدمہ تھا پہلا ادبِ لطیف میں شائع ہونے پر ہی ہوا تھا اور مجھ سے یہ غلطی اس لیے ہوئی کہ میں تو محض مقدمہ کے حوالے سے شاہد احمد دہلوی اور منٹو کے تعلق کی وضاحت کرنا چاہ رہا تھا۔ مقدمے کی تاریخی دستاویزات پیش کرنا میرا مقصد نہیں تھا لہٰذا میں اتنی تفصیل میں نہیں گیا لیکن بہرحال اسے میرا عذرِ بے جا ہی کہا جانا چاہیے کیونکہ غلطی بہرحال غلطی ہے اور اُسے مجھے تسلیم کرنا چاہیے لیکن ڈاکٹر صاحبہ نے اس غلطی کی نشان دہی نہ کی اور کسی اور ہی بکھیڑے میں الجھ گئیں۔ لیکن اب اگر یہ بات کھل ہی گئی ہے تو تھوڑی سی بات اس معاملے پر بھی کرلی جائے۔

یہ بات درست ہے کہ ''کالی شلوار'' پر پہلا مقدمہ ۱۹۴۲ء کو ادبِ لطیف میں شائع ہونے پر درج ہوا اور دوسرا مقدمہ ۴۵-۱۹۴۴ء کو مجموعہ ''دھواں'' کے حوالے سے ''کالی شلوار'' پر چلا لیکن یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ''کالی شلوار'' پہلی بار ادبِ لطیف ہی میں شائع ہوا کیونکہ بقول ڈاکٹر علی ثنا بخاری یہ مجموعہ (دھواں) جس میں افسانہ ''کالی شلوار'' شامل تھا، ساقی بک ڈپو سے ۱۹۴۱ء کو شائع ہوا۔ (انگارے، دسمبر ۲۰۰۵ء، شمارہ نمبر ۳۶، ص: ۱۶۷) ڈاکٹر انوار احمد نے بھی یہی سن اشاعت اور اشاعتی ادارہ درج کیا ہے۔ (اُردو افسانہ، تحقیق و تنقید، ص: ۲۰۸) اور پھر سب سے بڑھ کر منٹو کا اپنا بیان بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ بقول منٹو: ''میں ساقی بک ڈپو، دہلی کی مطبوعہ کتاب بعنوان ''دھواں'' کا مصنف ہوں یہ کتاب میں

نے ۱۹۴۱ء میں جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں ملازم تھا، ساقی بک ڈپو کے مالک میاں شاہد احمد دہلوی کے پاس غالباً تین یا ساڑھے تین سو روپے میں فروخت کی تھی۔ اس کے جملہ حقوق اشاعت اب ساقی بک ڈپو کے پاس ہیں۔'' (مضمون ''لذتِ سنگ''، منٹو نامہ، ص:۶۳۲)

یعنی ادبِ لطیف میں شائع ہونے سے پہلے یہ افسانہ مجموعہ کی صورت میں منظرِ عام پر آ چکا تھا مگر مقدمے کی زد میں نہیں آیا۔ منٹو نے اپنے مضمون ''سفید جھوٹ'' میں یہ ہی لکھا ہے کہ ''ماہوار رسالہ ادبِ لطیف، لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں میرا ایک افسانہ بعنوان ''کالی شلوار'' شائع ہوا تھا جسے لوگ فحش سمجھتے ہیں۔'' (منٹو نامہ، ص:۶۷۴) اور یہی فقرہ منٹو نے اپنے مضمون ''مجھے بھی کچھ کہنا ہے'' کے ابتدا میں بھی تحریر کیا ہے۔ (منٹو نما، ص:۳۲۷) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ منٹو نے یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا کہ میرا یہ افسانہ ''پہلی بار'' ادبِ لطیف میں شائع ہوا۔

دوسرا مقدمہ ''کالی شلوار'' پر ہوا تو جیسا ہم ذکر کر آئے ہیں کہ وہ مجموعہ ''دھواں'' پر مجموعی طور پر درج ہوا اور دو افسانے بطور خاص ''دھواں'' اور ''کالی شلوار'' مقدمہ کی زد میں آئے لیکن یہ مقدمہ ۴۵-۱۹۴۴ء کو اس وقت ہوا جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اور جس کی طرف منٹو نے اپنے مضمون ''لذت سنگ'' ہی میں صاف اشارہ کیا ہے۔ بقول منٹو ''اس کتاب کے جو نسخے میں نے عدالت میں دیکھے ہیں، اُن کے ملاحظے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔'' (منٹو نامہ، ص:۶۳۲) لیکن اس طرف ڈاکٹر علی ثنا بخاری صاحب نے توجہ نہیں فرمائی۔ انہوں نے ''دھواں'' کا سنِ اشاعت ۱۹۴۱ء درج کرنے کے بعد نیچے یہ لکھا ہے کہ ''منٹو کی یہ واحد کتاب ہے جس پر بحیثیت مجموعی فحاشی کے الزام میں منٹو کے خلاف مقدمہ درج ہوا تھا۔ اس مجموعے میں اُن کا افسانہ ''کالی شلوار'' بھی شامل ہے جس کی اشاعت پر قبل ازیں اُن کے خلاف فحاشی کے الزام میں پہلا مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔'' (انگارے، دسمبر ۲۰۰۵ء، شمارہ ۳۶، ص:۱۶۷) انہیں یہ بتانا چاہیے تھا کہ جس کتاب پر یہ مقدمہ درج ہوا وہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن تھا ورنہ اُن کے اس بیان سے الجھن پیدا ہو جاتی ہے کہ ''کالی شلوار'' پر پہلا مقدمہ تو ۱۹۴۲ء میں ادبِ لطیف کی اشاعت پر ہوا تو ۱۹۴۱ء سے پہلے کون سا مقدمہ ہوا۔

جگدیش چندر ودھاون نے بھی اس بات کی وضاحت نہیں کی۔ انہوں نے اپنی کتاب ''منٹو نامہ'' میں ''کالی شلوار'' اور ''دھواں'' پر اس مقدمہ کی روداد رقم کی ہے جو مجموعہ ''دھواں'' کے عنوان سے شائع ہونے والی کتاب پر درج ہوا اور جس میں شاہد احمد دہلوی ملوث ہوئے مگر یہ انہوں نے بھی بتانا گوارا نہیں کیا کہ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن تھا۔

اب جہاں تک اس مقدمے کی سنگینی کا سوال ہے تو اس کا اندازہ لگانے کے لیے ہم ایک بار پھر منٹو کے بیان سے رجوع کرتے ہیں۔ بقول منٹو ''اب کہ مقدمہ ساقی بک ڈپو، دہلی کی شائع کردہ کتاب ''دھواں'' پر تھا۔۔۔ اس دفعہ معاملہ کچھ زیادہ سنگین معلوم ہوا کیونکہ میرے اور مسٹر شاہد احمد دہلوی کے

علاوہ کاتب بھی گرفتار کر لیا گیا جس نے ''دھواں'' لکھنے کے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ کتب فروش بھی گرفتار کیے گئے جن کے پاس یہ ملعون کتاب موجود تھی۔ پریس جس میں یہ چھپی تھی، اُس کا مالک بھی دھر لیا گیا۔'' (لذتِ سنگ، منٹو نامہ، ص:۶۲۶)

بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ منٹو اور شاہد احمد دہلوی پر ''کالی شلوار'' کے سلسلے میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں ''کالی شلوار'' منٹو کے افسانوی مجموعہ ''دھواں'' میں شائع ہوا تھا اور پہلی بار اسی مجموعہ میں شائع ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن سوال یہ بھی ہے کہ مجموعہ کی صورت میں شائع ہونے سے قبل کیا ان افسانوں (''دھواں'' اور ''کالی شلوار'') کو شاہد احمد دہلوی نے اپنے رسالے ''ساقی'' میں شائع نہ کیا ہوگا؟ اس سوال کا اگرچہ مستند اور معتبر جواب میرے پاس نہیں اور اس کے لیے میں منٹو کے محققین سے رجوع کروں گا لیکن ایک بیان جگدیش چندر ودھاون کا ضرور ہے جسے ایک نظر ضرور دیکھ لیں۔ لکھتے ہیں: ''منٹو نے اپنے مشہور اور معتوب افسانے ''کالی شلوار'' اور ''دھواں'' اُن دنوں لکھے جب وہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں ملازم تھے۔ یہ دونوں افسانے پہلی بار نامور ادبی رسالے ''ساقی'' میں شائع ہوئے جس کے مالک اور ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی تھے۔ وہ ساقی بک ڈپو کے بھی مالک تھے جس نے منٹو کے افسانوں کے مجموعہ ''دھواں'' میں ان دونوں افسانوں کو شائع کیا تھا۔'' (منٹو نامہ، ص:۱۷۳)

بہر حال اب آخر میں ڈاکٹر صاحبہ کی ایک بے سر و پا دلیل کا ذکر ہو جائے۔ شاہد احمد دہلوی پر مقدمے کا ذکر کرنے کا میرا مقصد یہ تھا کہ منٹو اور شاہد کے گہرے تعلق کی وضاحت ہو سکے اور جس سے میں نے نتیجہ یہ نکالا تھا کہ ''اس تعلق کی نسبت سے ہم شاہد احمد دہلوی سے اس بات کی توقع نہیں کر سکتے کہ وہ غلطی سے کسی ایسے افسانہ کو منٹو کے نام سے اپنے جریدہ میں طبع کرتے جو سرے سے منٹو کا نہ ہو۔'' میرے اس بیان کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے ڈاکٹر شگفتہ صاحبہ لکھتی ہیں کہ ''گزارش ہے کہ وہ (شاہد احمد دہلوی) واقعی ایسی غلطی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ منٹو اور ساقی دونوں کی اپنی ایک reputation بہر حال تھی اور ہے (لفظ بہر حال پر غور کیا جائے۔ ا۔ خ۔ ف) اور یہ افسانہ منٹو کی زندگی ہی میں ساقی سے پہلے ادبِ لطیف میں شائع ہو چکا تھا۔ ان دنوں ادبِ لطیف کا حلقہ قارئین بھی بہت وسیع تھا اس لیے وہ غلطی نہیں کر سکتے تھے۔''

اس بیان کے اُسلوب اور عجیب و غریب جواز پر غور فرمائیے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کی راقم پر تنقید کم ہے اور ادبِ لطیف سے محبت کا اظہار زیادہ اور اسی بات کا دُکھ ہے۔ اُن کے پورے خط کی یہی سب سے بڑی خامی ہے کہ اُن پر ادبِ لطیف کی محبت اس قدر غالب آ گئی کہ وہ تنقید کا حق ادا نہ کر سکیں۔ مندرجہ بالا بیان کے اُسلوب سے ادبِ لطیف کے سامنے ساقی تو خیر الگ بات، منٹو کی اہمیت بھی ماند پڑتی دکھائی دیتی ہے اور اس بات سے نتیجہ کیا نکلتا ہے کہ اگر ادبِ لطیف میں مذکورہ افسانہ پہلے شائع نہ ہوتا اور اگر اُس کے قارئین کی تعداد زیادہ نہ ہوتی تو شاہد احمد دہلوی، منٹو کے نام سے کسی اور کا افسانہ شائع کرنے کی غلطی کر سکتے تھے۔ یعنی شاہد احمد دہلوی کا منٹو سے براہِ راست تعلق کم اور ادبِ لطیف

کے واسطے سے زیادہ تھا۔

ڈاکٹر صاحبہ کی خدمت میں گزارش ہے کہ ادبِ لطیف کی ادبی خدمات سے کسی کو انکار نہیں لیکن اگر وہ یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ ادبِ لطیف کے سوا کسی اور رسالے کی ایسی قدر و قیمت یا اہمیت نہیں تو ایسا ہرگز نہیں۔ مخزن، نیرنگ خیال، عصمت، نقوش، ہمایوں، ادبی دنیا اور ساقی یہ وہ تمام رسائل ہیں جو نہ صرف اپنی ادبی خدمات کے حوالے سے بلکہ اپنی مقبولیت کے حوالے سے بھی ادبِ لطیف سے کسی بھی طور کم تر درجہ پر فائز نہیں کیے جاسکتے۔ ساقی کی اہمیت میری زبان سے نہ سہی قرۃ العین حیدر کی زبان سے سن لیں جو یہاں تک کہتی ہیں کہ ''مخزن اور نیرنگ خیال اور عصمت کی طرح ساقی ایک تاریخ ساز ادبی ادارہ تھا۔ شاہد احمد دہلوی اور ساقی ایک عظیم الشان روایت تھے جس کی قدر و قیمت کا احساس اگر آج کل کے لوگوں کو نہیں تو اسے موجودہ ادبی دَور کی بدقسمتی سمجھا جاسکتا ہے۔'' (پکچر گیلری، ص:۹۴ تا ۹۵)

آخر میں ڈاکٹر صاحبہ نے راقم کے اس بیان کے حوالے سے کہ ''افسانے کا سیدھا سادہ، قدرتی اور بے ساختہ اُسلوب اور مکالمے، موضوع، کردار نگاری، ٹیکنیک، فضا اور فنکاری سب چیخ چیخ کر اعلان کررہے ہیں کہ یہ منٹو کا افسانہ ہے'' جو یہ کہا ہے کہ ''فاضل محقق یہاں کچھ جذباتی ہوگئے ہیں'' تو اگر وہ اس جملے میں سے صرف ''فاضل'' کا لفظ نکال دیں تو باقی جملہ سے میں بڑی حد تک متفق ہوں اور یہ امید بھی کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحبہ بھی آئندہ اپنے کہے کا بطور خاص خیال رکھیں گی۔

اور اب وہ اصل بات جس کے لیے یہ سارا خط تحریر کیا گیا۔ ہم اکثر و بیشتر یہ رونا روتے نظر آتے ہیں کہ ہمارے ہاں تحقیق نہیں ہورہی، تحقیق و تنقید کا کوئی معیار نہیں رہا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے لیے عملی طور پر جدوجہد کرتے نظر نہیں آتے۔ اتنی سی بات سمجھ نہیں پاتے کہ تحقیق، علم کے فروغ کا ذریعہ ہے، ہماری اپنی ذات یا اپنے ممدوح (ہمارا موضوع) کے فروغ کا ذریعہ نہیں۔ تحقیق و تنقید کی جس صورت حال کا ہمیں آج سامنا ہے اُس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نے تحقیق و تنقید کی قدروں کو پامال کررکھا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمیں ان قدروں کو بحال کرنے پر اپنی توانائیوں کو صرف کرنا ہے اور محض کہنے کی حد تک نہیں بلکہ عملی طور پر اس کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ ہمیں یہ خوب اچھی طرح سے جان لینا چاہیے کہ ہماری تحقیقی اور تنقیدی ہر دو طرح کی سرگرمیوں کا اصل مقصد علم کا فروغ ہے۔ علم کے فروغ کے ساتھ اگر آپ کی شخصیت بھی نمایاں ہو تو ٹھیک اور کسی دوسرے کی شخصیت پر داغ آئے تو بھی ٹھیک مگر یہ قطعاً درست نہیں کہ لکھنے والا اپنا پہلا اور اولین مقصد یعنی ''علم و ادب کا فروغ'' ایک طرف رکھ کر اپنی ذات کو نمایاں کرنے یا دوسرے کو داغ دار کرنے کے درپے ہوجائے جیسا کہ بالعموم ہمارے ہاں ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ڈاکٹر صاحبہ نے کہیں میری ذات کو داغ دار کرنے کی کوشش کی ہے یا کچھ اور۔ وہ تو بس جذبات کی رَو میں بہہ کر کچھ ایسی ویسی باتیں کرگئیں جو کچھ خاص نہیں۔ میں یہاں عمومی رویوں کی بات کررہا ہوں جو ہمارے ہاں تحقیق کے میدانوں میں رائج ہوچکے ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ آپ ضرور ایک دوسرے کی

کوتاہیوں کو نشان زد کریں، یہ علم دوستی کے لیے نہایت ضروری ہے مگر پوری تنقیدی اور تحقیقی ذمہ داری اور سلجھے ہوئے اُسلوب کے ساتھ۔ پھر اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرنے کی خُو بھی ڈالیں اور اس سارے عمل میں محض یہ مدِ نظر رکھیں کہ ہم صرف اور صرف علم و ادب کے فروغ میں حصہ لے رہے ہیں۔

ہمیں، نئی نسل ہی کو اس پرانی روش کو ترک کرنا ہے۔ تحقیق و تنقید کے میدانوں میں رائج منفی کلچر کو اپنے مثبت رویوں اور صحت مند فکری اور شعوری کاوشوں سے تبدیل کرنا ہے۔ صرف اتنی سی بات یاد رکھیں کہ ہمارے لیے منٹو، منٹو کا کوئی افسانہ، منٹو کا کوئی محقق، کوئی نقاد، کوئی تخلیق کار اور کوئی ادبی رسالہ چاہے وہ ادبِ لطیف ہی کیوں نہ ہو، بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ان تمام اشخاص، تخلیقات اور رسائل و جرائد کی اہمیت علم و ادب کے فروغ میں حصہ لینے کے بل بوتے پر ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے اصل کام یعنی ''علم و ادب کے فروغ'' کے ساتھ مخلص ہونا ہے اور بس۔ ورنہ میں یا آپ یا کوئی اور ____ کچھ بھی نہیں۔

بہرحال ڈاکٹر صاحبہ اپنی شائع ہونے والی دو عدد کتابوں (''وہ اور اُس کا ہمزاد'' اور ''ماہنامہ ادبِ لطیف کی ادبی خدمات'') پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں اور ممکن ہو تو ارسال بھی فرمائیں۔ پڑھ کر یقیناً خوشی ہوگی۔

(ایم خالد فیاض۔ گجرات)

''انگارے'' کا ۴۳واں شمارہ اپنی تپک اور جمالِ طباعت کے ساتھ آنکھیں سینکنے کو ملا، اِس کرم فرمائی پر ہم آپ کے سپاس دار ہیں۔ آپ فروغِ ادب کے لیے یکے وتنہا جو کارِ دارد بہ حُسنِ احسن سرانجام دے رہے ہیں، وہ آپ کے ادب دوست ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ ہم کافی دیر بحرِ مطالعہ میں مستغرق رہے، دراِیں کوشش کئی درہائے نایاب ہمارے ہاتھ لگے۔ آپ کا تحریر کردہ ہر اداریہ فکر انگیز و ذہن کشا ہوتا ہے۔ حالیہ شمارے میں آپ نے ازراہِ گفتگو احمد ندیم قاسمی کی وفات حسرت آیات کے حوالے سے تعزیتی اظہار کیا۔ قاسمی صاحب بلاشبہ ہمارے عہد کے سب سے قدآور شاعر، ادیب اور افسانہ نگار تھے، صرف یہی نہیں وہ کئی ادبی نسلوں کے راہ نما اور محسن بھی تھے۔ اُن کے سایۂ ہمایوں کے اُٹھ جانے سے ادبی دُنیا میں بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے کیوں کہ وہ ۲۰ویں صدی کے آخری بڑے شاعر و ادیب تھے، عفی عنہ، اُن کی رحلت پر ہمارا دل بہت ملول و مغموم ہے۔ بقولِ خود (قطعہ):

کیوں کر کہیں کہ سارا دبستاں اُجڑ گیا
احمد ندیم قاسمی ہم سے بچھڑ گیا
اب کے برس چمن میں کچھ ایسی ہوا چلی
شاخِ شجر سے آخری پتا بھی جھڑ گیا

مضامین میں نجیب جمال، غلام حسین ساجد، مزمل حسین اور نبیل احمد نبیل نے سامانِ مطالعہ بہم

پہنچایا۔ کہانیوں میں عباس برمانی اور لیاقت علی کی کہانیاں اپنے اندر ''کہانی پن'' لیے ہوئے تھیں۔ خصوصی گوشے میں ترک مہروی کا کلام ترپسندِ خاطر ہوا، البتہ صفحہ ۳۰ پر موجود چھٹی غزل کے بعض مصرعے عروضی مسقوم کا شکار نظر آئے (یعنی خارج از بحر تھے)، اُن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اِس دفعہ غزلوں کا حصہ خاصا بھرواں قسم کا تھا۔ ظفر اقبال، صابر ظفر، خاور اعجاز، کاشف مجید، سہیل غازی پوری اور مشتاق شبنم کی بعض غزلوں اور شعروں نے ہمیں درسِ حیرانی دیا۔ ظفر اقبال کی زود گوئی اور بسیار گوئی پریشان کُن ہے، وہ چھوٹی بات میں بڑا پیغام دینے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ حالیہ شمارے کی غزلوں کے بعض مصرعوں میں اُنہوں نے لفظ ''دفعہ'' کو بروزن ''مفا'' باندھا ہے جو عروضی سقم ہے۔ یہ لفظ اصلاً ''فعلن'' کے وزن پر ہے۔ اسی طرح گفتار خیالی اور مشتاق شبنم کی نظمیں بھی پسند آئیں۔ حروفِ زر کے بسرۂ اختلافات میں ڈاکٹر شگفتہ کا وضاحتی مکتوب اہم تھا۔ آخر میں حالیہ شمارے سے چند در چند منتخبہ اشعار حوالۂ قرطاس ہیں:

بہت چڑھا ہوا پانی ہوں اپنے دریا کا
سو ، لہر لہر اُچھلتا ہوا گزرتا ہوں (ظفر اقبال)

جو ساتھ لے کے چلے اور نہ واپس آنے دے
اُس ایک نقشِ کفِ پا کی سمت چلتے ہیں (صابر ظفر)

آیا وہ رات ، یوں اچانک
بے ساختہ جیسے نیند آئے (قاضی حبیب الرحمٰن)

دیے روشن تو ہیں پر یوں کہ جیسے
ہوا کی ترجمانی کر رہے ہیں (خاور اعجاز)

پتنگے تو بس اتنا جانتے ہیں
چراغِ انجمن ہی انجمن ہے (حفیظ شاہد)

پیڑ پر تھکے ہارے کچھ پرند بیٹھے ہیں
سیر کر کے لوٹے ہیں نیلے آسمانوں کی (سہیل غازی پوری)

جنہیں حیات کی حسرت تھی مر گئے وہ لوگ
جو چاہتے تھے کہ مر جائیں مر نہیں پائے (مشتاق شبنم)

یہ ناممکن ہے آنکھیں ساتھ دے پائیں
میں اِک ایسا نظارہ کرنے والا ہوں (کاشف مجید)

(پرویز ساحر۔ ایبٹ آباد)

''انگارہ'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نثری تخلیقات کی دستیابی کم ہوگئی

ہے اس لیے کہ منظومات کا حصہ قدرے زیادہ ہو گیا ہے۔ بیلنس ہو تو بہت بہتر مگر آپ کیا کر سکتے ہیں۔ نثر نگار ہیں ہی کم اور جو ہیں دادا ازم، سیریلزم، ماڈرن ازم یا مابعد جدیدیت جیسے مکڑی کے جالوں سے ابھی تک نکل نہیں پائے۔ یہ ایک وقت پے بہ پے اس قدر ''ازموں'' کا ورود وہ بھی ادب میں، ادب کا ستیاناس تو ہوگا۔ آج کل کوئی ایسی کارآمد یا ذہن کشا تحریر نہیں آ رہی اور آتی بھی ہے تو شاذ۔ ہمارے نقاد تو سانپوں کے گزر جانے کے بعد لکیروں کو پیٹ رہے ہیں اور کچھ سمتوں کا تعین کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ کیا لکھا جائے اور کچھ تکرارِ تخیل یا ازم پر اپنی تخلیقی توانائیاں ضائع کر رہے ہیں۔ آپ پیچھے مڑ کر دیکھیں جب اِن ازموں کا چرچا نہ تھا یا یہ نہ تھے تو کتنا شاندار ادب لکھا گیا۔ معاشرتی زندگی یا انسانی حیاتیات کی مقتضیات یا ترجیحات کو پیشِ نظر رکھا گیا۔ اس لیے کہ زندگی ہی تو اصل محرک ہے انسان کی سوچوں کا، تفکرات کا، اس کے تقاضے بنیادی طور پر ہر دَور ہر جگہ یکساں ہی رہے ہیں۔ درد و غم، دکھ سکھ، نان و نمک کے مسائل زندگی ساتھ لے کر چلتی ہے اور اس سے ہٹ کر ایک عام آدمی فرصت ہی نہیں پاتا کہ کسی ازم کی سوچے۔

میرے کہنے کا مقصد سمجھ گئے ہوں گے۔ عیاشی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک مالی اور دوسری ذہنی۔ مالدار جو ہیں وہ مالی عیاشیوں میں مگن ہیں۔ اُن کو نت نئے اندازِ زندگی کی سمائی رہتی ہے دوسرے ذہنی عیاشی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے غیر جبلتی تخیلات کی رنگینیوں میں مگن رہتے ہیں اور وہیں سے کوئی انوکھی یا غیر مروّجہ بات گھڑ کر لوگوں کے سامنے لاتے ہیں۔ یہاں صرف اور صرف خودستائی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ کوئی نئی بات کہو کہ مشہور ہو جاؤ۔ بات بھلے لایعنی ہو لوگ اس کی بھول بھلیوں میں پڑے رہیں گے یہ تو اکثر لوگوں سے سنا ہے جب کوئی فلسفہ یا ''تُک'' سمجھ میں نہ آئے تو کہتے ہیں بڑی بات ہے، بڑا دماغی آدمی یا فلسفی ہے وغیرہ۔ منطق جو فلسفہ کی بنیاد ہے یہ بھی کچھ ضابطہ یا اُصول رکھتا ہے۔ لایعنی ہاتھوں یا لاعمل خیالوں کو رَد کر دینا بھی منطق ہی کا حصہ ہے۔ جو بات برسوں کی فکر کے بعد سمجھ میں نہ آئے اُس پر اپنی عمر گنوانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ بہرکیف میں زیادہ عرض کرنا نہیں چاہتا آپ میرا مقصد سمجھ گئے ہوں گے یا یہ کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ آپ بہ ذاتِ خود زیرک اور ذہین مفکر ہیں آپ کے مضامین میں پڑھتا ہوں۔ اداریہ ایک کھلی کتاب ہی تو ہوتا ہے جس میں سب کچھ بیان کر دیتے ہیں۔ خدا کرے آپ کی صحت جسمانی اور ذہنی قائم و دائم رہے اور مزید حوصلے آپ کو خدا دے۔ میں دعا ہی کر سکتا ہوں، سو کرتا ہوں۔

(شارق بلیاوی۔ کراچی)

''چند باتوں'' میں ہم بھی آپ کی فکر میں شریک ہیں مگر صاحب کیا کیا جائے نوجوان لکھاری ہو یا بوڑھا، کوئی بھی جب اپنے منصب سے نا آشنا ہو جائے گا تو معاشرے کا یہی حال ہوتا ہے جو ہمارا ہے مگر اِس کے پیچھے لاتعداد وجوہات کارفرما ہیں جن کا ذکر یہاں اگر کر دیا جائے تو اعتراضات کی بوچھاڑ

ہو جائے گی کیونکہ حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے کیونکہ ہم سب اِس کارِ خیر کا سبب ہیں۔ اگر آج ہر فرد اپنی اپنی باری کا پودا ہی لگاتا رہتا تو اس قدر ویرانی نہ ہوتی لیکن کیا کیا جائے پیسے کی دَوڑ نے اندھا کر ڈالا۔ پچھلے دنوں بہت سے معروف ادبا اِس دنیا سے کوچ کر گئے اُن میں ڈاکٹر اعجاز راہی، ملک اختر شیرانی، سیّد سجاد بخاری اور احمد ندیم قاسمی، بلاشبہ اِن معتبر ہستیوں کا سایہ اُٹھ جانا ادب کے لیے باعثِ رنج ہے۔ خدا تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کریں (آمین)۔ اس کے علاوہ جہاز میں وفات پانے والے جملہ افراد کے لیے بھی ڈھیروں دعائیں۔

ڈاکٹر نجیب جمال کا مضمون ''معاملہ کی غزلیں'' سیر حاصل ہے اور غلام حسین ساجد کے فن اور کلام کی اُن پرتوں کو کھولتا ہے جو قاری سے اوجھل تھیں سب سے بڑی بات کہ نجیب کا اُسلوب بہت عمدہ ہے خصوصاً صفحہ ۱۰ کا دوسرا پیرا گراف تو نظمیہ آہنگ میں لکھی گئی عمدہ تنقیدی تحریر ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول کے بارے میں لکھا گیا مضمون غلام حسین ساجد کے مطالعے کی باریکیوں کا عمدہ نمونہ ہے۔ پروفیسر مزمل حسین نے ''ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوں کا لسانیاتی مطالعہ'' بڑے ماہرانہ انداز میں کیا ہے اور اتنے بڑے افسانہ نگار اور کہانی کار کو ایک چھوٹے سے مضمون پر ہی ٹرخا دیا ہے۔ مطلب یہ کہ ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا۔ عابد میر کا ''ادب سیاست اور تحریک'' بھی موضوع کے اعتبار سے بہت مختصر رہا لیکن جو لکھا ہے خوب ہے۔ نبیل احمد نبیل کا مضمون ''اُردو زبان کے تقاضے'' شاندار ہے۔ پہلے تو وہ صرف غزلوں پر ہی اکتفا کرتے تھے مگر ان کا یہ روپ بھی اعلیٰ ہے۔ بھئی کیوں نہ ہو، وہ آج کل ناصر عباس نیر جیسے نابغہ کے آس پاس جو رہتے ہیں۔ بہت مبارک باد آپ کے لیے یہ میدان اوپن ہے، دوڑیے ___!

ڈاکٹر عباس برمانی کا ''آب سراب'' اپنی جگہ مگر لیاقت علی نے ''دو شرطیں'' میں کہانی گری کی مہارت کو اِس خوبی سے نبھایا کہ دل سے فوراً شاباش نکلی۔ بھئی بہت خوب یہ یہاں کے ہر تیسرے بندے کی کہانی ہے اور یہ معاشرہ خلیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ ایک مکمل اور کامیاب کاوش ہے، لگے رہو۔ غزل کا حصہ جاندار ہے خصوصاً ظفر اقبال، خاور اعجاز، سہیل غازی پوری، عابد خورشید اور کاشف مجید نے بہت متاثر کیا۔ نظمیں تمام بہترین ہیں۔ نظمیں لکھیں بھئی اُردو ادب میں اچھی نظم کا کال ہے، صحن غزل تو بھرا پڑا ہے۔

(سید تحسین گیلانی۔ بورے والا)

''انگارے'' کا جولائی کا شمارہ مل گیا ہے۔ نثر کا حصہ بہت خوب صورت ہے مگر غزل کا حصہ بہت جاندار اور شاندار ہے۔ ضیا المصطفیٰ ترک مہروی کی پندرہ غزلیں شامل ہیں ایک سے بڑھ کر ایک شعر ہے۔ باقی غزلوں میں ظفر اقبال، صابر ظفر، خاور اعجاز، پرویز ساحر، کاشف مجید اور عابد خورشید کی غزلیں بہت اچھی لگی ہیں۔ مبشر مہدی کی نظم ''زرد آسماں'' بہت خوب صورت نظم ہے۔

(اسد عباس خان۔ جھنگ)

رسید و اطلاع:

افتخار عارف (اسلام آباد)، ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)، غلام حسین ساجد (لاہور)، ناصر حسین بخاری (اسلام آباد)، عطا الرحمٰن قاضی (عارف والا)، ظفر اقبال نادر (عارف والا)، حصیر نوری (کراچی)، صفدر علی شاہ (سرگودھا)، جمشید ساحل (لیہ)، ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں (پشاور)، ڈاکٹر خیال امروہوی (لیہ)، ننگر چنا (کوئٹہ)، احمد حسین مجاہد (مظفر آباد)، طارق اسد (لاہور)، احمد صغیر صدیقی (کراچی)، روش ندیم (راولپنڈی)، صابر ظفر (کراچی)، عرفان احمد خان (لاہور) احمد اعجاز (لیہ)

عہد ساز شاعر

ظفر اقبال

کے حوالے سے انگارے کا خصوصی شمارہ شائع کیا جا رہا ہے

ظفر اقبال نمبر

اکتوبر ۲۰۰۶ء

آپ سے گزارش ہے کہ ظفر اقبال کی فن و شخصیت کے حوالے سے اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تبصرے جلد از جلد ارسال فرمائیں۔